۱۶ نومبر ۲۰۱۷ء | بسم اللہ الرحمٰن الرحیم | جلد نمبر: ۱۰ ۔ شمارہ نمبر: ۲۲

پندرہ روزہ
معارف فیچر کراچی
MA'ARIF FEATURE
مدیر: سیّد شاہد ہاشمی
نائب مدیران: منعم ظفر خان، سید سمیع اللہ حسینی، نوید نون ۔ معاون مدیر: غیاث الدین
ڈی ۔ ۳۵، بلاک ۔ ۵، فیڈرل 'بی' ایریا، کراچی ۔ ۷۵۹۵۰
فون: ۳۶۸۰۹۲۰۱ ۔ ۳۶۳۴۹۸۴۰ ۔ ۳۶۳ (۲۱ ۔ ۹۲)، فیکس: ۳۶۳۶۱۰۴۰
برقی پتا: irak.pk@gmail.com، ویب گاہ: www.irak.pk
Fortnightly "Maarif Feature" Karachi: REG.No.SC-1303

۱ ۔ **معارف فیچر** ہر ماہ کی یکم اور سولہ تاریخوں کو شائع کیا جاتا ہے۔ اس میں دنیا بھر سے (ہمیں) دستیاب ایسی معلومات کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے، جو اسلام سے دلچسپی اور ملت اسلامیہ کا درد رکھنے والوں کے غور و فکر کے لیے اہم یا مفید ہو سکتی ہیں۔
۲ ۔ پیش کیا جانے والا لوازمہ بالعموم بلاتبصرہ شائع کیا جاتا ہے۔ کسی مضمون، نقطۂ نظر، خیال یا معلومات کے انتخاب کی وجہ اس سے ہمارا اتفاق نہیں، اس کی اہمیت ہوتی ہے۔ کسی مضمون یا معلومات کی مدلل تردید یا اس سے اختلاف پر مبنی لوازمہ کو بھی جگہ دی جا سکتی ہے۔
۳ ۔ **معارف فیچر** کو بہتر بنانے کے لیے مفید معلومات کے حصول یا ان کے ذرائع تک رسائی میں آپ کی مدد کا خیر مقدم کیا جائے گا۔
۴ ۔ ہمارے فراہم کردہ لوازمے کے مزید، لیکن غیر تجارتی ابلاغ کی عام اجازت ہے۔
۵ ۔ **معارف فیچر** کی کوئی قیمت مقرر نہیں۔ تاہم عطیات کی ضرورت بھی رہتی ہے اور عطیات قبول بھی کیے جاتے ہیں۔ **اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی**

سعودی عرب نئی راہ پر!

اگر محلاتی سازشوں کی حالیہ تاریخ کو بھی ذہن میں رکھیں تو جو کچھ سعودی عرب میں حال ہی میں ہوا ہے، وہ ہوش و حواس گم کر دینے والا تھا۔ ۴؍نومبر کو سعودی عرب میں اعلان کیا گیا کہ کرپشن کے خلاف بھرپور کریک ڈاؤن کے دوران درجنوں سرکردہ شخصیات کو حراست میں لے لیا گیا ہے۔ ان میں سب سے نمایاں شخصیت شہزادہ الولید بن طلال کی تھی جو سعودی ارب پتی ہیں۔ الولید بن طلال نے دنیا بھر میں سرمایہ کاری کر رکھی ہے۔ امریکا کے سٹی گروپ اور نیوز کارپوریشن میں بھی ان کے نمایاں شیئرز ہیں۔ تحویل میں لیے جانے والوں میں بہت سے شہزادوں کے ساتھ ساتھ متعدد موجودہ اور سابق وزرا، سعودی بن لادن گروپ کا چیئرمین اور مشرق وسطیٰ میں سب سے بڑے سیٹلائٹ نیٹ ورک کے سربراہ بھی شامل ہیں۔ جنہیں تحویل میں لیا گیا، انہیں ریاض کے شاندار رٹز کارلٹن ہوٹل میں رکھا گیا۔ جو لوگ وہاں ٹھہرے ہوئے تھے انہیں نکل جانے کو کہا گیا اور نئی بکنگ روک دی گئیں۔

جن لوگوں کو برطرف کیا گیا، ان میں ایک نمایاں نام نیشنل گارڈ کے سربراہ شہزادہ متعب بن عبداللہ کا تھا۔ ان تمام اقدامات کا بنیادی مقصد ولی عہد محمد بن سلمان کو زیادہ سے زیادہ مضبوط کرنا تھا۔ یہ کہنا غلط ہوگا کہ جو کچھ سعودی عرب میں ہوا اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ حقیقت یہ ہے کہ سعودی شاہی خاندان میں کسی ایک گروپ کی طاقت برقرار رکھنے پر محنت کی جاتی رہی ہے۔ سعودی عرب کے بانی شاہ عبدالعزیز کے حصّہ بنت احمد السدیری کے بطن سے پیدا ہونے والے بیٹوں میں اقتدار مرتکز رہا ہے۔ ''السدیری سیون'' کی اقتدار پر گرفت اس قدر مضبوط رہی ہے کہ شاہ عبدالعزیز کی دیگر اولاد ایک طرف رہی ہے۔

بھائیوں میں طاقت کا توازن بہت عمدگی سے برقرار رکھا گیا ہے۔ شہزادہ سلطان بن عبدالعزیز نے ۴۸ سال تک وزیر دفاع کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ شہزادہ نائف اور بعد میں ان کے بیٹے محمد نے کم و بیش چار عشروں تک وزارت داخلہ سنبھالی۔ ۱۹۶۳ء سے نیشنل گارڈ کا چارج سابق شاہ عبداللہ بن عبدالعزیز اور ان کے اہل خانہ میں رہا۔

وزارت دفاع، وزارت داخلہ اور نیشنل گارڈ...... تینوں اب ولی عہد محمد بن سلمان کے کنٹرول میں ہیں۔ اندرونی حلقے میں وہ MBS کی عرفیت سے پہچانے جاتے ہیں۔ سلمان بن عبدالعزیز کے بادشاہ بنتے ہی چند گھنٹوں میں محمد بن سلمان نے وزارت دفاع سنبھال لی تھی۔ جون میں باپ اور بیٹے نے مل کر سابق ولی عہد محمد بن نائف کو وزیر داخلہ کے منصب سے معزول کر کے گھر میں نظر بند کر دیا۔ اور اس کے بعد شاہ عبداللہ مرحوم کے دوسرے بیٹے شہزادہ متعب کو معزول کر دیا گیا۔ شہزادہ متعب کے بادشاہ بننے کا امکان خاصا قوی تھا۔

معاشی اور دفاعی اعتبار سے اہم گردانے جانے والے ہر منصب پر تبدیلی شاہ سلمان بن عبدالعزیز کے نام پر کی گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ ان تمام تبدیلیوں کی پشت پر ولی عہد محمد بن سلمان ہیں۔ ۳۲ سالہ محمد بن سلمان نے اپنی ذات میں غیر معمولی یا خطرناک حد تک طاقت مرتکز کر لی ہے اور اب سعودی عرب کو معاشی اور معاشرتی اعتبار سے تبدیل کرنے کے ایجنڈے پر عمل شروع کر دیا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ سعودی معیشت کا انحصار کلاً تیل کی دولت پر نہ رہے۔

ستمبر میں سعودی پولیس نے کریک ڈاؤن کرتے ہوئے حکومت پر تنقید کے الزام میں انسانی حقوق کے متعدد کارکنوں اور درجنوں علمائے کرام کو گرفتار کیا تھا۔ اس کریک ڈاؤن کے فوراً بعد شاہ سلمان بن عبدالعزیز نے خواتین کے گاڑی چلانے پر پابندی ختم کرنے کا اعلان کیا۔ اس کے چند ہی ہفتوں بعد محمد بن سلمان نے ایک عظیم الشان کانفرنس منعقد کی جس میں ''اعتدال پسند اسلام'' کا راگ الاپ کر قومی معیشت کو جدید خطوط پر استوار کرنے کے لیے ۵۰۰؍ارب ڈالر کے ''نیوم پروجیکٹ'' کا اعلان کیا۔ اس جدید ترین منصوبے میں بیشتر اسٹاف روبوٹس پر مشتمل ہوگا۔ ملک میں تھیٹرز قائم کرنے کی اجازت سمیت محمد بن سلمان کے پاس بہت سے معاشرتی اور معاشی منصوبے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ ریاستی ملکیت کی آئل کمپنی آرامکو کی نجکاری بھی کی جانی ہے۔

سعودی عرب میں رونما ہونے والی تبدیلیاں ایک اہم مرحلے پر آئی ہیں۔ پڑوس میں یمن کا برا حال ہے۔ ۲۰۱۵ء میں حکومت کا تختہ الٹنے والے حوثی باغیوں کو ہرانے کے لیے سعودی عرب نے جو جنگ شروع کی، اس نے یمن کو شدید ابتری سے دوچار کر رکھا ہے۔ دارالحکومت صنعا اور شمالی یمن کا کچھ حصہ اب بھی حوثی باغیوں کے کنٹرول میں ہے۔ حوثی باغی سعودی علاقوں پر میزائل

اندرونی صفحات پر:۔

- مشرقِ وسطیٰ: وَرَق، پھر اُلٹ رہا ہے!
- لبنان: سعودی عرب کا اگلا یمن؟
- امریکا کی نئی پاکستان پالیسی؟
- اتحادی اور ان کے اثرات
- امریکا، عراق اور کردوں کے درمیان ثالثی کرا سکتا ہے؟
- اعلانِ بیلفور کے ۱۰۰ سال
- جرمنی میں مذہب اور لادینی ریاست
- ٹرمپ آمریت پر فریفتہ

فائر کرتے رہتے ہیں۔ سعودی عرب میں جدید ترین دفاعی مشینری کی مدد سے میزائل بروقت جھپٹ لیے جاتے ہیں۔ یمن کو کنٹرول کرنے کی سعودی کوششیں اسی طور ناکام رہی ہیں جس طور گیس کی دولت سے مالا مال قطر کو کنٹرول کرنے کے لیے پانچ ماہ قبل شروع کی جانے والی اس کی ناکہ بندی ناکامی سے دوچار رہوئی تھی۔ اس ناکہ بندی کا بنیادی مقصد صرف یہ تھا کہ قطر انقلاب پسند اسلامی گروپوں کی حمایت ترک کر دے۔

دوسری طرف سعودی عرب کا علاقائی حریف ایران تیزی سے تقویت پا رہا ہے۔ جو کچھ سعودی عرب یا خطے میں ہو رہا ہے، اس کے نتیجے میں ایران کی طاقت بڑھ رہی ہے اور وہ بہتر تیاری کے ساتھ میدان میں آنے کی تیاری کر رہا ہے۔ لبنان میں ایران کا اثر و نفوذ اس حد تک بڑھ چکا ہے کہ لبنانی وزیر اعظم سعد الحریری نے سعودی دارالحکومت ریاض پہنچ کر وزیر اعظم کے منصب سے مستعفی ہونے کا اعلان کر دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ جس طور ۲۰۰۵ء میں ایران نے ان کے والد کو قتل کرایا تھا بالکل اُسی طور انہیں بھی قتل کرا دیا جائے گا۔

جو کچھ سعودی عرب میں ہو رہا ہے، اس کے حوالے سے بیان کی جانے والی کہانیوں پر یقین کرنے والے کم ہیں۔ کرپشن کے خلاف کریک ڈاؤن کی بات پر یقین کرنے والے کم ہیں۔ سعودی عرب میں کرپشن کوئی بنیادی ایشو ہے ہی نہیں۔ ہاں، طاقت کو چند ہاتھوں میں مرتکز رکھنے کی بات پر سبھی یقین کرنے کو تیار ہیں۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ جو کچھ سعودی عرب میں ہو رہا ہے، وہ طاقت کو چند ہاتھوں میں مرتکز رکھنے کے مخالفین کو کنٹرول کرنے کے کھاتے میں ہے۔ ولی عہد محمد بن سلمان جو کچھ چاہتے ہیں اُس کی مخالفت کرنے والوں کی تعداد اچھی خاصی ہے۔ گرفتاریاں بھی بلا جواز معلوم ہوتی ہیں۔ شہزادہ متعب سے قطع نظر جن افسران کو بلیک لسٹ کیا گیا ہے، وہ بہت کمزور ہیں اور ریاست کے لیے کسی بھی طور خطرہ نہیں بن سکتے۔ شہزادہ الولید بن طلال اگرچہ بہت مالدار ہیں اور دنیا بھر میں انہوں نے سرمایہ کاری کر رکھی ہے، مگر سعودی پالیسیوں کی تشکیل میں ان کا کوئی کردار نہیں۔ وہ ایوان ہائے اقتدار میں غیر معمولی اثر و نفوذ کے بھی حامل نہیں۔

محمد بن سلمان نے خود کو سعودی پالیسیوں کے واحد چہرے کی حیثیت سے دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔ ساری طاقت اپنی ذات میں مرتکز کر کے وہ صرف خرابیاں پیدا کر رہے ہیں اور جب خرابیاں بڑھ جائیں گی تب ناقدین کو سوچنا نہیں پڑے گا کہ الزام کس پر دھرا جائے۔ (ترجمہ: محمد ابراہیم خان)

"Saudi Arabia's unprecedented shake-up". (The Economist". Nov.5, 2017)

سعودی ولی عہد: طاقت کا خطرناک کھیل

David Ignatius

سعودی ولی عہد شہزادہ محمد بن سلمان کا کہنا ہے کہ وہ بدعنوانی کے خلاف مہم چلا رہے ہیں، لیکن ہفتہ کی رات کابینہ کے وزرا اور سینئر شہزادوں کی وسیع پیمانے پر گرفتاریوں نے بہت سے عرب مبصرین کو حیران و پریشان کر دیا کہ ان کا قدم اقتدار اور اختیار کو تقویت دینے کا خطرناک کھیل ہے۔

شہزادہ محمد بن سلمان، ۳۲ سالہ سعودی ولی عہد نے سلطنت کی انتہائی ممتاز کاروباری اور سیاسی شخصیات کے خلاف کارروائی کی ہے تاکہ ملک میں سیاسی غلبے کے علاوہ تیل سے مالا مال سلطنت میں صوابدیدی تبدیلیاں رونما کی جائیں۔ لیکن سعودی عرب کی ملکیت ''العربیہ نیوز چینل'' کے مطابق گرفتار شدگان میں ۱۱ شہزادے، ۴ وزرا اور درجنوں دیگر افراد شامل ہیں۔ ایک سعودی کاروباری کے مطابق سعودی ولی عہد شہزادہ محمد سلمان ایک ''نیا سعودی عرب'' تخلیق کر رہے ہیں۔ مزید یہ کہ بدعنوانی کے خلاف مہم، ایک جارحانہ لیکن متنازع طرزِ عمل ہے جس کے تحت سعودی خواتین کو گاڑی چلانے کی اجازت دینے کے علاوہ مذہبی پولیس پر پابندیوں کا نفاذ کیا گیا ہے۔

گرفتار شدگان کی فہرست میں شہزادہ متعب بن عبداللہ بھی شامل ہیں، جو سابق شاہ کے بیٹے اور سعودی نیشنل گارڈ کے سربراہ ہیں اور یہ عہدہ روایتی طور پر قبائلی قوت کا مظہر ہوتا ہے۔ نیشنل گارڈ، شاہی خاندان میں توازن برقرار رکھنے کا ایک طریقہ ہوتا ہے لیکن شہزادہ متعب بن عبداللہ کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ انہوں نے یہ توازن بگاڑ دیا تھا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سعودی ولی عہد شہزادہ محمد بن سلمان سعودی عرب میں روایتی نظام طرزِ حکمرانی کو دانستہ مسمار کر رہے ہیں، جو ایک سست رو لیکن بعض اوقات شاہی خاندان میں موثر اتفاق اور رضامندی پر مشتمل ہے، لیکن نوجوان شہزادے نے جارحانہ انداز میں انتظامی اختیار اور قوت کو اپنے ہاتھ میں لے کر اسے اپنے ایجنڈے کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔ سعودی ولی عہد شہزادہ محمد بن سلمان کی طرف سے ان کے اس جارحانہ طرزِ عمل کا آغاز اس وقت ایک ہفتے پہلے ہو گیا تھا، جب انہوں نے دنیا بھر کے فنی ماہرین اور کاروباری تجربہ کار افراد کی ایک کانفرنس کی میزبانی کی۔ ہفتہ کی رات کی گئی گرفتاریوں سے مخملی دستانے میں آہنی مکے کی موجودگی کا احساس ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنی اس مہم کا احوال ایک ویڈیو کلپ میں بیان کیا ہے، جو اس وقت سعودی میڈیا پر گردش کر رہی ہے جس میں وہ عوام کو یقین دلا رہے ہیں کہ بدعنوانی میں ملوث کسی بھی فرد کو (خواہ شہزادہ ہو یا وزیر یا کوئی دوسرا فرد) معاف نہیں کیا جائے گا۔ ان گرفتاریوں کے ساتھ ہی ایک سپریم کمیٹی بھی تشکیل دی گئی ہے تاکہ گرفتار شدگان کی بدعنوانی کی تفتیش کی جائے۔ کمیٹی کو یہ حق حاصل ہے کہ ضرورت کے مطابق کوئی بھی ضروری قدم اٹھا سکتی ہے جس کے تحت بدعنوانی میں ملوث فرد کے اثاثے ضبط کرنے کے علاوہ اس پر سفری پابندی بھی عائد کی جا سکتی ہے۔ سعودی ولی عہد شہزادہ محمد بن سلمان نے اپنے اس قدم کے ذریعے وہ راستہ اختیار کیا ہے جو انہیں سعودی نوجوانوں میں مقبول بنا سکے۔ نسلوں سے بدعنوانی، سعودی معاشرے میں سرایت کر چکی ہے جس کے باعث شاہی خزانہ کھوکھلا ہو چکا ہے، اور ملک میں جدیدیت کی راہ میں مشکلات کھڑی ہو رہی ہیں۔ سعودی ولی عہد کا یہ قدم ان سعودی نوجوانوں کو متحرک کر سکتا ہے جو ایک نئی سلطنت کے خواہاں ہیں۔ وہ یہ بھی توقع کر رہے ہیں کہ وہ مذہبی برادری کی حمایت سے ملک سے اشرافیہ کا قلع قمع کر دیں گے۔

سعودی ولی عہد نے اب سابق بادشاہ عبداللہ کی طرف سے قیادت کے تخلیق شدہ نظام کو منتشر کر دیا ہے، جن کی وفات ۲۰۱۵ء میں ہوئی۔ شہزادہ متعب کے علاوہ سعودی ولی عہد شہزادہ محمد بن سلمان نے شہزادہ ترکی بن عبداللہ کو بھی گرفتار کر لیا ہے جو ایک اور ممتاز بیٹے اور صوبہ ریاض کے سابق گورنر ہیں۔ علاوہ ازیں خالد بن توجیری کی بھی گرفتاری ہوئی ہے جنہوں نے عبداللہ کے شاہی دربار کے سربراہ کی حیثیت سے عملی وزیر اعظم کا کردار ادا کیا تھا۔ جون میں سعودی ولی عہد شہزادہ محمد بن سلمان نے سابق ولی عہد محمد بن نائف کو بھی عہدے سے ہٹا دیا تھا جنہوں نے بالآخر ان کے ۸۱ سالہ والد کا جانشین بننا تھا۔

اصلاحات کا نعرہ بلند کرنے کے ساتھ اس ہفتے سعودی ولی عہد شہزادہ محمد بن سلمان کی طرف سے اختیار کیا گیا مطلق العنان طرزِ عمل دیگر ممالک مثلاً چین کے مطلق العنان طرزِ عمل کے مترادف ہے۔ جہاں چینی صدر شی جن پنگ نے بھی بدعنوانی کے خلاف مہم کے نام پر اپنے سیاسی مخالفین کو نکال باہر کیا ہے۔

باقی صفحہ نمبر ۹

مشرقِ وسطیٰ: وَرَق، پھر اُلٹ رہا ہے!

سید شاہد ہاشمی

دنیا کے بیشتر ممالک کے موجودہ نقشے اور حدودِ اَربعہ، بیسویں صدی کی عالمگیر جنگوں کے زیر اثر بنے ہیں۔ یقیناً مشرقِ وسطیٰ بھی اس میں شامل ہے۔ اس خطے کے ممالک مگر، تاریخی، جغرافیائی، نسلی، لسانی، تہذیبی۔۔۔ کسی بھی عامل سے زیادہ۔۔۔ سابق استعماری قوتوں کی خواہشات کے تحت۔۔۔ میز پر کھینچی گئی لکیروں سے بنے ہیں۔ مثلاً لبنان، شام، اُردن، اسرائیل، عراق، کویت، سعودی عرب، اومان، وغیرہ کے نقشے دیکھیے۔۔۔ لگتا ہے کہ سیدھی سیدھی لکیریں کھینچ کر، یہ نئے ممالک، عالمی نقشے میں ''کاڑھے'' گئے ہیں۔ یہ تمام ممالک، ماضی میں بڑی سلطنتوں کے صوبے یا ضلع ہوا کرتے تھے۔ یورپ کی استعماری اقوام۔۔۔ خصوصاً برطانیہ اور فرانس نے۔۔۔ اپنی استعماری سوچ کے مطابق، یہ نئے ممالک تخلیق کر دیے۔ ان کی تشکیل میں، ریاست ہائے متحدہ امریکا عملاً شریک نہیں تھا۔

اب تاریخ کا پہیہ، ایسے مقام پر آ گیا ہے کہ آج کی سب سے بڑی استعماری قوت، ریاست ہائے متحدہ امریکا اور اُس کے اتحادی یورپی ممالک اور اسرائیل کو ''نیا مشرقِ وسطیٰ'' درکار ہے۔ چنانچہ گزشتہ صدی کے اختتام کے ساتھ ہی، نئے عہد اور نئی سرحدوں کا بگل بجا دیا گیا ہے۔ علاقائی عناصر و عوامل کو مارچ کا حکم مل چکا ہے۔ تمام ہرکارے، کارندے، پیادے، فِیل و فرزیں۔۔۔ روبوٹس کی طرح حرکت میں آ چکے ہیں۔ پرانے زمانے کے راجاؤں اور نوابوں کے شکار کے لیے۔۔۔ جس طرح 'ہانکا' لگا کرتا تھا۔۔۔ مشرقِ وسطیٰ میں شکار اور شکاری اور اُن کے ہانکا لگانے والے۔۔۔ سبھی اس کھیل کا حصہ بن کر، اپنا اپنا کردار بخوبی نبھا رہے ہیں۔ شاید اگلے ایک عشرے کے اندر ہی، مطلوب ''نیا مشرقِ وسطیٰ'' تشکیل پا جانے کی خواہش و کوشش ہے۔ ہم ''اہلِ حرم'' حسبِ سابق اِس ''رومَن اکھاڑے'' کی سیڑھیوں پر بیٹھے محض تماشائی ہیں۔۔۔ جو اپنی بھوک اور اِفلاس، اپنا دکھ اور غم غلط کرنے کے لیے۔۔۔ یہ کھیل دیکھ رہے ہیں، تبصرے کر رہے ہیں، یا زیادہ سے زیادہ، اس میں مُعاون و مددگار بننے کی خواہش رکھتے ہیں۔

مشرقِ وسطیٰ کے حالیہ اکھاڑے میں جاری کھیل کا جائزہ لیا جائے تو چیدہ چیدہ نِکات، اس طرح سامنے آتے ہیں:۔

۱) دنیا کے موجودہ تناظر میں، چار مسلم ممالک ایسے ہیں۔۔۔ جن کے حالات و واقعات، جن کا عمل اور بے عملی (یا بدعملی)، جن کا استحکام یا انہدام اور جن کی قوت و یکجہتی یا کمزوری و انتشار۔۔۔ سارے عالمِ اسلام کو سب سے زیادہ متاثر کر سکتا ہے اور کرے گا۔ یہ ممالک سعودی عرب، مصر، ترکی اور پاکستان ہیں!!!

۲) اگر یہ چاروں ممالک ہم آہنگ ہو کر، ایک دوسرے کے ہاتھ تھام کر اور باہمی اعتماد و مشاورت کے ساتھ۔۔۔ عالمی بساطِ سیاست پر، دھیرے دھیرے ہی سہی، لیکن مظبوط قدم رکھتے چلیں۔۔۔ تو مسلم اُمّہ کی بے چارگی و بے بسی میں تیزی سے، قابلِ لحاظ کمی آتی جائے گی۔

۳) اِس ''اِتحادِ اَربعہ'' کے جُھرمٹ میں کئی اور مسلم اور غیر مسلم ممالک، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ، شامل ہوتے جائیں گے۔ یوں یہ نیا ''عالمی بلاک''۔۔۔ آج کی بے توازن اور بے کَل دنیا میں۔۔۔ قدرے توازن و قرار کا ذریعہ بن سکے گا۔

۴) چند برس قبل اللہ نے یہ سُنہری گھڑی قریب کر دی تھی۔۔۔ جب مصر میں ڈاکٹر محمد مُرسی کی جسٹس پارٹی کی حکومت قائم ہو گئی تھی، اور ترکی میں رجب طیب اِردوان کی اے کے پی' کی حکومت سے اُس کا بڑا اچھا تعلق پروان چڑھ رہا تھا۔ گویا ''اتحادِ اربعہ'' کے لیے حالات سازگار ہونے جا رہے تھے۔

۵) بدقسمتی سے آلِ سعود کے پچھلے بادشاہ اور کچھ شہزادے، امارات کے حکمراں، خصوصاً ان کے موجودہ ولی عہد، اسرائیلی لابی اور مغربی استعمار نے۔۔۔ مصر پر، اور اُمّت پر نہایت اوچھا وار اور تاریخی ظلم کیا۔ یہ گویا سنبھلتی اور قسمت بدلتی مسلم دنیا کی پیٹھ میں خنجر گھونپ دینے کے مترادف تھا۔

۶) اِسی دوران، شام کے معاملے میں جو ہوا، وہ حکمتِ عملی اور اسٹریٹیجی کے لحاظ سے مہان بلنڈر تھا۔ اسرائیل کی پشت پناہ مغربی قوتوں نے سازش کا جو جال بُنا۔۔۔ بدقسمتی سے اُس میں ترکی، سعودی عرب، قطر اور بعض دیگر عرب حکومتیں۔۔۔ یہاں تک کہ شام کے اِخوان بھی، حیرت انگیز طور پر، بڑی آسانی سے پھنس گئے۔ اب اُن کے گلے میں گویا ''چھچھوندر'' پڑا ہے۔ ۱۹۸۱ء میں بھی شام کی اِخوان، اپنے نوجوان عنصر کے دباؤ میں آ کر ''خروج'' کی خودکُش غلطی کر چکی تھی۔ جس کا خمیازہ رُبع صدی تک، اُسے بھگتنا پڑا۔

خدا جانے ہمارے یہ دوست ممالک اس استعماری و صیہونی جال سے، بسلامت کیونکر نکل پائیں گے؟

۷) ایک مضبوط رائے رہی ہے کہ شام کو اُس کے حال پر ہی چھوڑ دینا چاہیے تھا۔ بشار الاسد کی ''علوی'' یا ''نُصیری'' حکومت سے امّتِ مسلمہ کو، یا اتحادِ امت کو۔۔۔ کوئی فوری خطرہ لاحق نہیں تھا۔ بلکہ دمشق میں ''حماس'' کو ایک مناسب اور مضبوط ٹھکانا میسر تھا، جو اَب اُس سے چھن چکا ہے۔ شامی فوج کی صورت میں، اسرائیل کے سامنے ایک مظبوط عسکری قوت بھی موجود تھی، جو کلیتاً تباہ ہو گئی ہے۔ اَربوں ڈالرز میں خریدے ہوئے لڑاکا جہاز، ٹینک، توپیں، میزائل، گولا بارود۔۔۔ یا تو استعماری قوتوں کی بمباری سے تباہ ہو گئے، یا اپنے ہی لوگوں سے لڑنے میں ضائع ہو گئے۔ شام، اِس علاقہ میں نسبتاً بہتر فوج رکھتا تھا۔ وہ فوج اسرائیلی نفسیات کو کانٹے کی طرح کھٹکتی تھی۔ خانہ جنگی میں وہ بھی تتر بتر ہو گئی۔

ابتدا ہی سے مجھے شام کا یہ سارا ''جہاد'' سمجھ نہیں آتا تھا۔ اب تو یہ امر اظہر من الشمس ہو چکا ہے کہ یہ بہت بڑا اسٹریٹیجک بلنڈر تھا۔ شام میں، چھ سال سے، ملّی خودکُشی کی ''گلوٹین مشین''، مسلسل چل رہی ہے۔ مسلم دنیا میں صدیوں سے موجود۔۔۔ سب سے بڑی فرقہ وارانہ (شیعہ، سُنّی) تقسیم۔۔۔ زیادہ شدّت سے نمایاں ہو کر، عالمگیر پیمانے پر سامنے آ کھڑی ہوئی ہے۔ عصرِ رواں کی استعماری قوتوں نے، اِس تقسیم کو مؤثر طور پر بروئے کار لا کر۔۔۔ اپنے بہت سے منصوبے آگے بڑھائے ہیں، اور وہ اس کا دائرہ مزید بڑھائیں گی۔ فی الحال اِس میں کمی کا بظاہر کم ہی امکان ہے۔

۸) یہاں یہ بھی عرض ہے کہ مسلم ممالک میں، عہدِ ماضی والے ''تصورِ خروج'' پر نظرِ ثانی کی ضرورت ہے۔ بالخصوص ایسی دنیا میں جہاں دشمنانِ دین و ملّت، ہر قابلِ لحاظ مسلم ملک کا تیاپانچا اور ''قیمہ'' کرنے کی مہم پر، صاف دِکھائی دے رہے ہیں۔ یہ بھی واضح رہے کہ ''خروج'' ''ایک سیاسی اجتہاد اور ''فقہِ سیاسیات'' کی ایک اصطلاح ہے۔ یہ نہ ایمانی مسئلہ ہے، اور نہ فرائض و واجبات سے اِس کا کوئی تعلق ہے۔ البتہ انسانی تمدن کے

ایک خاص دَور سے متعلق ضرور رہا ہے۔ (اتفاق سے مَیں علمِ سیاسیات کا طالب علم بھی ہوں۔)

۹) مصر کو جس طرح، عملاً ''اسرائیلی تولیّت'' میں دے دیا گیا ہے، اس عاقبت نااندیش اور ملّی بربادی میں آلِ سعود اور سَلَفی مکتبِ فکر کے کلیدی کردار پر غور کرتا ہوں تو دل بڑا خراب ہوتا ہے۔ کئی بار میرا بڑا دل چاہا کہ اُن کے لیے قُنوت والی بددعائیں کروں۔ حج پر گیا تو وہاں بھی یہی دل چاہا۔ مگر میرے دماغ نے میری زبان پکڑے رکھی۔ اِس بات کو سمجھنا ضروری ہے کہ سعودی عرب کا داخلی انتشار، چاہے وہ شاہی خاندان کے اندر ہو، یا پوری مملکت میں۔۔۔ فی زمانہ ہرگز باعثِ خیر نہ ہوگا۔ اِس سے ہمارے دین و ملّت کو کچھ نہیں ملے گا۔۔۔ بلکہ امت میں اِس کا نفسیاتی فال آؤٹ ہمارے اندازوں سے کہیں زیادہ ہوگا۔

۱۰) عربستان کے جنوب مغربی کونے پر، یمن میں جو ہو رہا ہے۔۔۔ اس کے دو فعّال ترین فریقین میں ایک طرف ایران ہے، تو دوسری طرف سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات۔ دونوں فریقوں نے جس عاقبت نااندیشی کا مظاہرہ کیا ہے، اس سے یمن تو برباد ہو ہی رہا ہے۔۔۔ مگر تیل کا جو پیسہ دھواں بن کر اُڑ رہا ہے، اور ملّی وجود میں نفرتوں کا جو زہر سرایت کر چکا ہے۔۔۔ اُس کے کامل اثرات آہستہ آہستہ ہی ظاہر ہوں گے۔

۱۱) آنسو کے قطرے جیسے ننھے سے ملک قطر کے خلاف جو ''چار کا ٹولہ'' سامنے آیا ہے، اُس کی حیثیت شکاری شِکرہ سے زیادہ نہیں۔ اصل فیصلہ ساز تو وہ ہاتھ اور ذہن ہے جس نے اِن شِکروں کو ''قطر کا کبوتر'' شکار کرنے پر مامور کیا ہے۔ قطر کے خلاف اقدام کرنے کے بعد۔۔۔ چند ماہ کے اندر ہمارے عرب بھائیوں نے کوئی ڈیڑھ سو اَرب ڈالر (ایک سو ساٹھ کھرب روپے) کے سودے، صرف امریکا سے اسلحہ خریدنے کے لیے کر لیے ہیں۔ آنے والے برسوں میں اس سے چھ گنا زیادہ خریداری کی نوید بھی دے دی گئی ہے (پاکستان کا کُل بیرونی قرضہ ۸۴ ارب ڈالر ہے)۔ یہ اسلحہ کس کے خلاف خریدا جا رہا ہے؟ ایک دوسرے کے خلاف! صیہونی ریاست، اسرائیل سے مستقبل قریب میں کوئی جنگ ہونی ہے اور نہ اس سے کوئی ''خطرہ'' باقی رہا ہے۔ جنگ اس لیے نہیں ہونی کہ اسرائیلی مقاصد، بغیر کوئی گولی چلائے حاصل ہو رہے ہیں۔ پھر اُسے عربوں سے لڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ ''خطرہ'' اس لیے نہیں کہ اب اسرائیل سے دوستی کی مسابقت شروع ہوگئی ہے۔ سعودی عرب کا ولی عہد، اسرائیل کا خاموش دورہ کر کے آ چکا ہے۔ دونوں حکومتوں میں مسلسل رابطہ ہے اور مفاہمت کے مختلف منصوبوں پر کام جاری ہے۔ شاید تین تا چھے ماہ میں کسی باقاعدہ مفاہمت کا اعلان بھی ہو جائے گا۔

۱۲) ایسا لگتا ہے کہ اَب لبنان پر، ''حزب اللہ'' کے خاتمے کے نام پر چڑھائی کا ارادہ ہے۔ ایسی یلغار کو امریکا، اسرائیل، مصر اور سعودی عرب کی تائید حاصل ہوگی۔ اس کے بعد ''حماس'' کی باری آئے گی۔ لیکن اُسے غالباً ''گلا گھونٹ'' کر مارنا طے پایا ہے۔

۱۳) سعودی عرب اور ایران میں تصادم ہو یا زبانی جنگ جاری رہے۔۔۔ دونوں صورتوں میں خطہ، عدم استحکام اور نفرتوں کی آماج گاہ بنا رہے گا۔ اس صورتحال کا بڑا گہرا اثر، پوری مسلم دنیا پر پڑے گا۔ وہ بھی عدم استحکام اور نفرتوں کی زہرناک فضا کا شکار ہوگی۔

۱۴) ایران بھی، ساسانی سلطنت کے خاتمے کے بعد۔۔۔ پہلی بار عروج کے ایسے زینے کو اپنے سامنے دیکھ رہا ہے۔۔۔ جو اُس کے لیے حالات نے، اور خود اُس کی حکمت کاری نے ممکن بنا دیا ہے۔ مشرق میں زاہدان سے لے کر، مغرب میں بیروت تک، اس کو وسیع و کشادہ عمل داری مل رہی ہے۔ مسلم تاریخ میں ایسا پہلی بار ہو رہا ہے۔ خود بغداد پر، کسی شیعہ حکومت کا قیام، اب سے پہلے کبھی نہیں ممکن ہوا تھا۔ یہ صورتحال مسلمانوں کے سوادِ اعظم (سُنّی دنیا) کے لیے ہضم کرنا سہل نہیں۔ اہلِ مغرب اس ذہنی ونفسیاتی وجذباتی تقسیم کو، اپنے مقاصد کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔ امریکا اور ایران میں غالباً کوئی باقاعدہ مفاہمت نہیں ہے۔۔۔ مگر ''سوئے اتفاق'' سے دونوں قوتیں، تاریخ کے ایک ہی صفحے پر لا کھڑی کی گئی ہیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ ڈپلومیسی میں بہرحال، اہلِ فارس بہت آگے ہیں۔ اس کی شہادت آئے دن کے حالات وواقعات دے رہے ہیں۔

۱۵) سعودی عرب کے حکمراں خاندان میں ان دنوں جو ٹوٹ پھوٹ اور محلاتی کشمکش جاری ہے۔۔۔ اس سے ملک اور حکمراں طبقے کا داخلی استحکام بری طرح متاثر ہوگا۔ آلِ سعود کی حکومت، اب تک ''باہمی اتفاق واتحاد'' کے پائے پر کھڑی تھی۔ اگر یہ پایہ کمزور ہو گا تو پورا محل ضعف وانہدام کے خطروں سے دوچار ہو جائے گا۔ ایسے میں استعماری قوتوں کے لیے اپنے من مانے فیصلے کروانا آسان ہو جاتا ہے۔ فی الوقت تو آلِ سعود کا حال وہی ہے، جو مغلوں کی حکومت کے آخری سو سالوں میں ہوا تھا کہ فرنگیوں سے ساز باز کر کے ولی عہد اور بادشاہ تبدیل کروائے جاتے تھے۔

۱۶) دو عشروں سے، مغرب کی دانش گاہوں اور پالیسی سازی کے مراکز میں۔۔۔ دو مسلم اقوام سے ''ہمدردی'' کا مروڑ اُٹھ رہا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ دو قومیں ایسی ہیں، جنہیں ممالک دستیاب نہیں۔۔۔ حالانکہ وہ اپنے لیے، الگ الگ ریاستیں بنانے کا پورا استحقاق رکھتی ہیں۔ یہ دو مسلم قومیں ''کُرد'' اور ''بلوچ'' ہیں۔۔۔ ایک طرف کردستان کی پیدائش کے لیے زمین ہموار کی جا رہی ہے۔۔۔ تو دوسری طرف بلوچستان کے لیے جوڑ توڑ زوروں پر ہے۔ پہلے مشن کے لیے، اسرائیل کو اسائنمنٹ دیا گیا ہے، اور دوسرے کی ذمہ داری بھارت کے سپرد کی گئی ہے۔۔۔ بیک وقت دونوں پر کام جاری ہے۔ لیکن زیادہ تیزی ''کردستان'' کے معاملے میں دکھائی جا رہی ہے۔ اس کے نتیجہ میں ترکی، شام، عراق، ایران بُری طرح متاثر ہوں گے۔ جبکہ گریٹر بلوچستان کے مشن کا ہدف۔۔۔ پاکستان، ایران اور افغانستان کو ''کٹ ٹو سائز'' کرنا ہے۔

۱۷) سعودی عرب، اپنے اثاثے بیچنے کا اعلان کر چکا ہے۔ اپنے بجٹ کے خسارے پورے کرنے کے لیے، اپنا زرِ محفوظ پہلے ہی استعمال کرنا شروع کر چکا ہے۔ عالمی مالیاتی اداروں سے قرض لینے کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا ہے۔ نیز ایک بہت بڑا پراجیکٹ ''نیوم'' (NEOM) کے نام سے اسرائیلی سرحد کے قریب شروع کرنے والا ہے۔ ہزاروں مربع میل پر مشتمل، یہ ایسا ''سعودی عرب'' ہوگا، جہاں سعودی عرب کی اقدار وروایات اور شرعی قوانین کا داخلہ ممنوع ہوگا۔ یہ پراجیکٹ مکمل ہو سکے گا یا نہیں، یہ بتانا دشوار ہے۔ البتہ اس کے نام پر پیٹرول کی دولت، پانی کی طرح بہے گی۔۔۔ اور بہہ کر مغربی استعماری معیشت کا حصہ بنے گی۔

۱۸) بہت اہم بات جاننے اور سمجھنے کی یہ بھی ہے کہ اس وقت آٹھ مسلم ممالک، اپنا وجود عملاً کھو چکے ہیں۔ وہ صرف ''اٹلس'' پر نظر آتے ہیں۔ حقیقتاً وہ ''نان ایگزسٹنٹ'' ہیں یا ''ناکام ریاستیں''۔ نام ملاحظہ کیجیے:

افغانستان، عراق، شام، لبنان، یمن، لیبیا، صومالیہ اور مالی۔

باقی صفحہ نمبر ۹

لبنان: سعودی عرب کا اگلا یمن؟

Halim Shebaya

لبنان کے وزیرِاعظم سعد الحریری نے سعودی عرب پہنچنے کے بعد منصب چھوڑنے کا اعلان کر کے ایک دنیا کو حیرت میں ڈال دیا۔ان کے مستعفی ہونے کے ایک ہفتے بعد لبنان نے یہ پوچھنا چھوڑ دیا کہ وہ کہاں ہیں یا کیسے ہیں اور اب ان کی رہائی کا مطالبہ کیا جارہا ہے۔ لبنانی صدر مچل عونے سعد الحریری کے غائب ہوجانے کے حالات کو انتہائی پراسرار قرار دیتے ہوئے سعودی عرب سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ اس حوالے سے وضاحت کرے۔ کئی ممالک کے سفیروں سے ملاقات کے دوران لبنانی صدر نے ایک قدم آگے جاکر یہ بھی کہا کہ سعد الحریری کو اغوا کرلیا گیا ہے۔سعد الحریری مختصر دورے پر ریاض گئے تھے اور ان کی واپسی طے تھی۔مگر پھر یہ ہوا کہ ان کی طرف سے مستعفی ہونے کا اعلان کردیا گیا۔

میں نے لبنان میں سیریک لیگ کے صدر اور صدر مچل عون کے بہت نزدیک سمجھے جانے والے تھنک ٹینک لیونٹ انکاونٹر کے سیکرٹری جنرل حبیب الفرم سے بات کی۔انہوں نے مجھے کیلینڈر میں ایک انٹری دکھائی،جس کے مطابق سعد الحریری کو ۶ نومبر کو رات گیارہ بجے ایک انٹرویو کے لیے ٹی وی اسٹوڈیو آنا تھا،مگر پھر اچانک یہ ہوا کہ انہوں نے العربیہ کے کیمروں کے سامنے منصب چھوڑنے کا اعلان کردیا۔یہ واقعہ ۴ نومبر کا ہے۔استعفے کے اعلان سے چند گھنٹے پہلے حبیب الفرم کو وزیرِاعظم کے دفتر سے فون آیا تھا،یعنی خود وزیرِاعظم سعد الحریری کے اسٹاف کو بھی معلوم نہ تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔

سعد الحریری اب ریاض میں اُسی طور پھنس کر رہ گئے ہیں،جس طور یمن کے صدر عبدربہ منصور ہادی پھنسے ہوئے ہیں۔انہیں بھی کئی ماہ سے ریاض چھوڑنے کی اجازت نہیں دی گئی۔سعودی عرب میں معاملات جتنی تیزی سے تبدیل ہو رہے ہیں اس کی روشنی میں لبنان اور دوسرے بہت سے علاقائی ممالک میں یہ خدشہ پروان چڑھ رہا ہے کہ سعودی عرب کو کہیں ڈھکی چھپی جنگ یا خانہ جنگی کا سامنا تو نہیں۔

ذرائع بتاتے ہیں کہ سعد الحریری کو حزب اللہ کی طرف سے قتل کیے جانے کا خدشہ تھا اس لیے انہوں نے سعودی عرب پہنچ کر ولی عہد سلمان بن عبدالعزیز سے ملاقات کے دوران استعفیٰ پیش کردیا۔دوسری طرف حزب اللہ نے سعد الحریری کے خدشے کو یکسر بے بنیاد قرار دیا ہے۔سعودی عرب نے سعد الحریری کے بڑے بھائی بہا الحریری کو وزیرِاعظم بنانے کا فیصلہ کرتے ہوئے حریری فیملی کے دیگر ارکان سے کہا ہے کہ وہ ریاض آکر اس فیصلے کی تائید کا اعلان کریں تاکہ لبنان میں سیاسی بحران ختم ہو۔(جہاں تک مسلح جدوجہد کا معاملہ ہے، لبنان میں کوئی بھی جماعت ابھر کر سامنے نہیں آئے گی۔)

لبنان کے وزیرِداخلہ موہاد میکنوک کہتے ہیں کہ لبنانی کوئی بھیڑوں کا گلہ نہیں کہ کوئی ہانک کر کہیں بھی لے جائے۔اور یہ ملک کوئی پلاٹ نہیں،جس کی ملکیت کا دعویٰ کوئی بھی کر بیٹھے۔لبنان میں جمہوری نظام ہے۔ یہاں بیعت لینے والا معاملہ نہیں چل سکتا۔

جو کچھ ہورہا ہے اُسے لبنان کی خودمختاری اور اقتدارِاعلیٰ پر حملے ہی سے تعبیر کیا جائے گا۔لبنان میں اس حوالے سے شدید مزاحمت پائی جاتی ہے۔سعودی عرب کے چند ایک شدید اور غیر لچک دار حامیوں کے سوا سبھی ان معاملات کی مخالفت کررہے ہیں۔ان میں سابق وزیرِانصاف اور ٹریپولی کے معروف و مضبوط سنی رہنما اشرف ریفی کے علاوہ عیسائیوں کی جماعت لیبنیز فورسز کے سربراہ سمیر گیگی بھی شامل ہیں، جن کے نزدیک سعد الحریری کا استعفیٰ حیرت انگیز نہیں تھا،ہاں ٹائمنگ تھوڑی سی حیرت انگیز ضرور تھی۔

سعودی عرب، متحدہ عرب امارات، کویت اور بحرین نے بیروت میں مقیم اپنے شہریوں سے کہا ہے کہ وہ فوراً لبنان سے نکل جائیں۔سعودی عرب اور اس کے ہم خیال ممالک نے الزام عائد کیا ہے کہ لبنان نے ان کے خلاف جنگ چھیڑ دی ہے۔سعودی عرب نے اپنے شہریوں کو لبنان کے سفر سے پہلی بار نہیں روکا۔فروری ۲۰۱۶ء میں تہران میں سعودی سفارت خانے پر حملے کے بعد بھی ریاض نے لبنان سے اپنے شہریوں کو نکل جانے کا حکم دیا تھا۔تب یہ جواز پیش کیا گیا تھا کہ لبنان نے ایرانی جارحیت کی مذمت کرنے میں تساہل اور بزدلی کا مظاہرہ کیا ہے۔بعد میں جب مچل عون صدر اور سعد الحریری وزیرِاعظم بنائے گئے تب کشیدگی کم ہوئی اور لبنان کے معاملات درستی کی راہ پر گامزن ہوئے۔

اس وقت لبنان کے باشندے شدید خوف کا شکار ہیں۔ایک طرف سعودی عرب کی طرف سے معاشی اور عسکری نوعیت کے اقدامات کا خدشہ ہے اور دوسری طرف اسرائیل کی طرف سے بھی جارحیت کا خدشہ ہے کیونکہ اسرائیلی قیادت نے سعد الحریری کے مستعفی ہونے سے پہلے ہی اشارہ دیا تھا کہ حزب اللہ سے ایک بار پھر بھرپور لڑائی ہوسکتی ہے۔

لبنان میں ایران کا ایک حلیف،حزب اللہ ملیشیا،مکمل طور پر مسلح اور تیاری کی حالت میں ہے۔سوال صرف یہ ہے کہ سعودی قیادت لبنان میں ویسا ہی کچھ کرنا چاہے گی جیسا اس نے یمن میں کیا؟ کیا وہ لبنان میں حزب اللہ سے براہِ راست تصادم کی راہ پر گامزن ہوگی؟ اگر ایسا کچھ ہوا تو لبنان میں معاملات بہت خراب ہوجائیں گے۔اس وقت لبنان میں شام اور فلسطین کے لاکھوں پناہ گزین مقیم ہیں۔جنگ یا خانہ جنگی سے ان کے لیے بھی مشکلات غیر معمولی حد تک بڑھ جائیں گی۔شام،یمن اور عراق میں حالات انتہائی ناگفتہ بہ ہیں۔ایسے میں اگر لبنان بھی میدان جنگ میں تبدیل ہوا یا کردیا گیا تو خطے میں شدید انتشار پھیلے گا،قتل و غارت کا نیا بازار گرم ہوگا اور کئی نئے بحران جنم لیں گے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ لبنان جنگ نہیں چاہتا۔سعودی حکام جو کچھ کہہ رہے ہیں،وہ لبنان میں معاملات کو خراب کرنے اور کشیدگی کو بڑھانے کے لیے کافی ہے۔سعودی حکام نے لبنانی صدر اور پارلیمان کے اسپیکر کو دہشت گردوں کی صف میں شامل کرنے سے بھی گریز نہیں کیا۔اس طرح کے الزامات سے لبنانی عوام کے جذبات مجروح ہوئے ہیں۔انہوں نے سوشل میڈیا پر شدید ردعمل ظاہر کیا ہے اور معاملہ اس حد تک آگے بڑھا کہ وزیرِانصاف سلیم جریساتی نے پراسیکیوٹر جنرل کو حکم دیا کہ وہ صدر،اسپیکر اور کابینہ کے ارکان کے خلاف سعودی الزامات کی تحقیقات کریں اور اس امر کا جائزہ لیں کہ اس توہین پر سعودی عرب سے جواب طلبی کی جانی چاہیے یا نہیں۔

اگر سعودی عرب نے سعد الحریری کے استعفے کی شکل میں حزب اللہ کے خلاف کوئی محاذ کھڑا کرنے کی کوشش کی تھی تو یہ کوشش ناکامی سے دوچار ہوتی دکھائی دے رہی ہے کیونکہ لبنان میں قومی سطح پر وحدت اور یگانگت دکھائی دے رہی ہے۔اب تک ایسا نہیں لگتا ہے کہ یہ ملک کسی بھی سطح پر کسی جنگ کے لیے تیار ہے۔

لبنان میں سعودی عرب کی حمایت کرنے والے بہت ہیں،مگر سوال یہ ہے کہ جب مکمل جنگ ہوگی تب وہ کیا رویہ

باقی صفحہ نمبر ۹

امریکا کی نئی پاکستان پالیسی؟

Jonah Blank

"آپ توقعات کم رکھیں تو مایوس نہیں ہوں گے" بھارت کے ناجائز مطالبات کے جواب میں امریکی پالیسی سازوں کا یہ جواب ایک معمول ہے، امریکی وزیرخارجہ ریکس ٹیلرسن کے نئی دہلی کے حالیہ دورے پر بھی بھارتی قیادت کو یہی مشورہ دیا گیا ہوگا، وزیراعظم نریندر مودی کے گرم جوش استقبال، گاندھی سمرتی کی خوشگوار مثالیں اور روشن مستقبل کے وعدوں کے باوجود امریکی پالیسی میں بنیادی تبدیلیوں کی توقع نہیں رکھی جانی چاہیے، بھارت کی ٹرمپ انتظامیہ سے وابستہ توقعات کو حقیقت پسند بنانے کی کئی وجوہات ہیں، قطع نظر اس بات کے کہ امریکی صدر یا وزیرخارجہ کیا کرسکتے ہیں، امریکا کی پاکستان کے لیے کوئی نئی پالیسی نہیں ہے اور نہ ہی مستقبل قریب میں ہوگی، ۲۱راگست کو ٹرمپ نے پاکستان سے نمٹنے کے لیے نئی پالیسی اپنانے کا اعلان کیا، ان کا کہنا تھا کہ "ہم زیادہ عرصے خاموش نہیں رہ سکتے، اس بیان پر اسلام آباد اور نئی دہلی کے کان کھڑے ہوگئے، لیکن امریکا کی نئی جنوب ایشیائی پالیسی کے اعلان کے دو ماہ گزرنے کے باوجود عوامی سطح پر پاکستان کے خلاف کوئی اہم قدم نہیں اٹھایا گیا، اگر زیرسمندر تبدیلی کا کوئی عمل جاری ہے تو وہ لہروں کے نیچے پوشیدہ ہے، اس پر حیرت نہیں کی جانی چاہیے، جب تک پاکستان کے پڑوس افغانستان میں امریکی فوجی موجود رہیں گے، پاکستان کی لاجسٹک سپورٹ اور زمینی راستوں پر امریکا کا انحصار رہے گا، پاکستان کا طالبان اور حقانی نیٹ ورک پر اثرورسوخ سب سے اہم ہے، مزید ۵۰۰۰ فوجی بھیجنے کے بعد افغانستان میں امریکا کا کردار کم ہونے کے بجائے بڑھ جائے گا، اکتوبر کے وسط میں ایک زبردست مظاہرہ دیکھنے میں آیا، جب ۱۲راکتوبر کو ایک امریکی خاتون اور ان کے کینیڈین شوہر کو ۳ بچوں سمیت پانچ سال بعد حقانیوں کی قید سے آزاد کرالیا گیا، خواہ یہ ایک مناسب وقت پر کی گئی فوجی کارروائی ہو یا خفیہ بات چیت کے بعد کیا گیا آپریشن، اس کارروائی سے امریکا کو پاکستان کے مددگار ہونے اور نقصان پہنچانے کی صلاحیت کی یقین دہانی کرادی گئی ہے، اس کے بعد ٹیلرسن نے پاکستانی حکومت اور فوج کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اس کارروائی کو پاک امریکا مضبوط تعلقات اور دہشت گردی کے خلاف عزم کے لیے اہم قرار دیا، امریکا اور بھارت چین کے حوالے سے پالیسی پر بھی متفق نہیں ہیں، اکتوبر کے آغاز میں ٹیلرسن نے چین اور بھارت کے ساتھ امریکا کے تعلقات کے تناظر میں اہم تقریر کی، ان کا کہنا تھا کہ "ہمارے چین کے ساتھ بھارت جیسے تعلقات نہیں ہوسکتے، چین ایک غیرجمہوری معاشرہ اور بھارت ایک جمہوریت ہے" انہوں نے چین کے بیلٹ اور روڈ منصوبے پر بھی شدید تنقید کی، انہوں نے اس منصوبے کے متبادل کے لیے فنڈز کے حوالے سے امریکا اور بھارت کی مشترکہ کوششوں کی پیشکش بھی کی، لیکن ٹیلرسن نے نہیں بتایا کہ اس طرح کے کسی منصوبے کے لیے فنڈز کہاں سے آسکتے ہیں، چین نے بیلٹ اور روڈ منصوبے کے ایک ٹکڑے کے لیے پاکستان کو ۴۶ رارب ڈالر دینے کا وعدہ کیا ہے، امریکی انتظامیہ نے خارجی امور کے حوالے سے ۲۸ فیصد بجٹ کٹوتی کا منصوبہ بنایا ہے اور ٹیلرسن اس منصوبے کی مکمل حمایت کررہے ہیں، بھارت کی جانب سے بھی دوسرے ملکوں میں سڑکوں اور ریلوے انفرااسٹرکچر کی تعمیر پر اربوں خرچ کرنے کا کوئی امکان نہیں کیونکہ بھارت کو خود بنیادی ڈھانچے کی ضرورت ہے، اس کے علاوہ بھارت چین کے کردار کو محدود کرنے کے لیے اتحاد بنانے کے مشورے پر عمل کرنے سے مسلسل گریزاں رہا ہے، اس موسم گرما میں ڈوکلام میں ہونے والی جھڑپوں کے بعد بھارت پالیسی بدل سکتا ہے، اگر ایسا ہوتا ہے تو دہلی کو یاد رکھنا چاہیے کہ ٹرمپ انتظامیہ اس کے برعکس جاسکتی ہے، مثال کے طور پر چین کے ساتھ گزشتہ ۲۵ برسوں کے بدترین تنازع کے باوجود جاپانی وزیراعظم نے بھارت کے حق میں ایک بیان تک نہ دیا، امریکا اور بھارت، افغانستان اور ایران کے معاملے پر مختلف موقف رکھتے ہیں، ٹرمپ انتظامیہ کی نظر میں افغانستان ایک امریکی پراجیکٹ ہے، وہ افغان معاملے میں بھارت کے ساتھ سودے بازی کرنا چاہتے ہیں، ۲۱راگست کی تقریر میں صدر ٹرمپ کا کہنا تھا کہ "بھارت امریکا سے تجارت کرکے اربوں ڈالر کماتا ہے، ہم افغانستان میں بھارت کی مزید مدد چاہتے ہیں" مگر بھارت کا اپنا ایجنڈا ہے، بھارت نے افغانستان کو ۳ رارب ڈالر امداد اور سرمایہ کاری کی شکل میں فراہم کیے ہیں، اس میں زیادہ رقم افغانستان کو ایرانی بندرگاہ چاہ بہار سے منسلک کرنے پر خرچ ہوگی، چاہ بہار کی تعمیر کا بھارتی منصوبہ چین کے بیلٹ اور روڈ منصوبے کے توڑ کے لیے سب سے اہم منصوبہ ہے، یہ منصوبہ پاکستان سے گزرے بغیر خشکی میں گھرے افغانستان تک روڈ، ریل اور سمندری راستے سے رسائی کو محفوظ بناتا ہے، یہ بھارت، ایران اور افغانستان کے لیے ایک بہتر راستہ ثابت ہوگا، لیکن مشکل یہ ہے کہ ٹرمپ انتظامیہ ایران کی عالمی تجارتی سرگرمیوں کو روکنے کی پوری کوشش کررہی ہے، ۱۳راکتوبر کو صدر ٹرمپ نے ایران کے ساتھ ۲۰۱۵ء میں ہونے والے اہم جوہری معاہدے کی تصدیق کرنے سے انکار کردیا، یہ معاہدہ ایران اور چھ عالمی طاقتوں کے درمیان ہوا تھا، ٹرمپ نے اس معاہدے کو امریکی تاریخ کا بدترین یکطرفہ سمجھوتا قرار دیا اور ایران پر نئی پابندیوں کا اعلان بھی کیا، اس اقدام سے ٹرمپ کے تہران پر معاشی دباؤ ڈالنے کی پالیسی کا اظہار بھی ہوگیا، جس کے بعد افغانستان اور ایران کے درمیان سڑکوں اور ریل منصوبوں پر بھارت کی جانب سے کی جانی والی ہر سرمایہ کاری کو امریکی مفاد کے خلاف تصور کیے جانے کا امکان ہے اور اس حوالے سے بھارت نے بھاری سرمایہ کاری کی ہے، وزیرخارجہ ٹیلرسن کا دورہ غیرحقیقت پسندانہ خواہشات کے انتہا پر جانے کا آخری موقع ثابت نہیں ہوگا، موجودہ امریکی انتظامیہ کے دور میں ایسے مواقع ابھی اور بھی آئیں گے، صدر ٹرمپ کے دورہ بھارت پر بھی یہی صورتحال پیش آسکتی ہے، اگر واشنگٹن میں گردش کرنے والی افواہیں درست ہیں تو اقوام متحدہ میں امریکی سفیر نکی ہیلی ٹیلرسن کی جگہ لے سکتی ہیں، نکی پہلی بھارتی نژاد امریکی وزیرخارجہ ہوں گی، نکی ہیلی کے وزیرخارجہ بننے کی صورت میں بہت سے مبصرین امریکا بھارت تعلقات میں انقلابی تبدیلیوں کی پیش گوئی کریں گے، لیکن ان کی یہ پیش گوئی غلط ثابت ہوسکتی ہے، خاموشی کے ساتھ تعلقات کو مضبوط کرنا اچھی خبر ہوگی، دونوں ممالک گزشتہ دو دہائیوں کے درمیان ایک دوسرے سے کافی قریب آگئے ہیں، اس دوران تین بھارتی وزیراعظم اور تین امریکی صدور نے اپنے اپنے ممالک کی نمائندگی کی، مختلف سیاسی جماعتوں کی حکومت میں بھی یہ تعلقات آگے بڑھتے رہے، ان تعلقات میں کئی نشیب و فراز بھی آئے اور بین الاقوامی تعلقات میں ایسا ہی ہوتا ہے، بھارت اور امریکا تعلقات میں گرم جوشی ہمیشہ برقرار رہی، کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وائٹ ہاؤس میں کون بیٹھا ہے اور دہلی میں کس کی حکومت ہے۔

(ترجمہ: سیدطالوت اختر)

"Despite Tillerson, U.S. won't abandon Pakistan for India". ("rand.org". October 27, 2017)

اتحادی اور ان کے اثرات

John B. Alterman

دنیا میں قاعدے کا نظام موجود نہیں ہے یہاں ۷۳ پر تین بھاری ہیں، تین ملکوں کا اتحاد ۷۳ ملکوں کے اتحاد کے گرد گھیرا تنگ کر رہا ہے، یہ پُر تشدد احکامات جاری کر کے نظام کو درہم برہم کرتا ہے۔

اس سارے تناظر میں یہ دیکھنا بہت دلکش ہے کہ اتحادی اپنے بارے میں بہت خوش فہم ہیں اور اسی خوش فہمی کے ساتھ آگے بڑھ رہے ہیں، امریکا کو اس بات کی کوئی فکر نہیں کہ دنیا اس کی حمایت کرتی ہے یا نہیں لیکن شام کی صورتحال کچھ اور داستان سناتی ہے۔ یہاں امریکا اپنے حمایتی ڈھونڈے گا اور ہم ایک ایسا وقت بھی دیکھیں گے جب امریکا کو شام میں مزید اور مزید اتحادیوں کی ضرورت پڑے گی۔

امریکا نے شام کی جنگ میں کودنے سے پہلے یہ دعویٰ کیا تھا کہ وہ صرف داعش کے خاتمہ چاہتا ہے اور اسے بشار الاسد سے کوئی مسئلہ نہیں ہے لیکن بشار اور داعش کے آپس میں گہرے رابطے موجود ہیں، بشار الاسد نے داعش کو فروغ دیا ہے اور پُرامن حزب اختلاف کو بری طرح تشدد کا نشانہ بنایا ہے وہ داعش کو اپنے دشمنوں کے خلاف ایک ہتھیار سمجھتا رہے گا چاہے اس کی یہ تشدد پسندی دنیا کو اس سے کتنا ہی متنفر کردے۔ امریکا یہ امید رکھتا ہے کہ وہ داعش اور بشار، دونوں کو اپنے قابو میں کرلے گا لیکن اسے اس بات کا بھی ڈر ہے کہ بشار کی تشدد پسند ذہنیت اسلامی انتہا پسندی کو بڑھائے گی۔ امریکا نے داعش کے خلاف دنیا کے ۶۰ ممالک کا اتحاد بنایا پھر یہ تعداد ۶۵ تک گئی اور اب ۷۳ اتحادی داعش کے خلاف اکٹھے ہیں، یہ انتہا پسندوں کے ذریعے پرامن شامی حزب اختلاف کی خواہش رکھتے ہیں۔

امریکا کا دل کبھی کبھی پرجوش شامیوں کے لیے بھی دھڑکتا ہے اور یہی چیز اسے صرف بشار الاسد ہی نہیں بلکہ روس اور ایران کے مخالفین میں کھڑا کر دیتی ہے۔ بشار، روس اور ایران شامی باغیوں کے خلاف متحد ہیں اور یہ امریکا اور اس کے اتحادیوں کو اپنے خلاف جاتے دیکھ رہے ہیں۔ ان تینوں ممالک کے مطابق شام کے موجودہ حالات تباہ کن ہیں لیکن یہ شام کے مستقبل کے لیے ضروری ہیں، بشار، روس اور ایران یہ نہیں چاہتے کہ اس خطے میں کوئی امریکا نواز سنی حکومت آئے یا پھر کوئی انتہا پسند طاقت اپنے قدم جمائے، یہ دونوں صورتحال ان تینوں ممالک کے لیے قابل قبول نہیں ہیں۔ ان تینوں کے مفادات مشترک ہیں، یہ ایک دوسرے کے لیے سہولت کار ہیں، چند اقدار مشترک ہونے کے علاوہ کوئی بڑا منصوبہ پیش نظر نہیں ہے۔ یہ اتحاد دنیا کے لیے کچھ نیا کرنا نہیں چاہتا بلکہ یہ اس لیے بنا ہے کہ یہ صرف اپنی حفاظت، اپنا دفاع چاہتا ہے۔

بیسویں صدی میں امریکا کے کردار پر غور کریں، اس صدی میں امریکا نے اپنے اتحادیوں کے ساتھ مل کر دو عظیم جنگیں لڑیں، جو کچھ اس نے دنیا کے لیے کیا وہ محض سوویت یونین کے خلاف مزاحمت نہیں تھی، بلکہ وہ ایک اصول پر مبنی نظام کی تشکیل تھی، جس نے آزاد معاشی نظام، تجارتی اور اقتصادی ترقی اور جمہوری نظامِ حکومت کو فروغ دیا، اس نظام کا مقصد صرف اور صرف امریکی مخالفین کو ایک ایک کر کے کمزور کرنا تھا، اگر امریکا پہلے کی طرح طاقتور ہوتا تو اس تین ملکی اتحادی دائرے کے لیے اکیلا کافی ہوتا، بجائے اس کے امریکا نے ان سے نمٹنے کے لیے کئی ممالک کا اتحاد تشکیل دیا، جو امریکا کے مقاصد سے متفق رہے گا اور مستقبل میں امریکا کے لیے اسی طرح کام کرتا رہے گا۔

امریکا نے اپنے اتحادیوں سے اقتصادی اور عسکری فائدے حاصل کیے، لیکن زیادہ اہم بات یہ ہے کہ حیرت انگیز طور پر اس اتحاد کی وجہ سے ملکوں کے درمیان تصادم کم ہوئے، اتحادیوں نے ایک دوسرے سے تعاون کی پالیسی اپنائی اور ایک دوسرے کے مقاصد کے لیے کام کیا، سب سے اہم بات یہ کہ جس نے امریکا کی بات کو رد کیا اتحادیوں نے اس کے خلاف آواز اٹھائی۔

یہ مغرب کا بڑا اتحاد تھا جس نے متحرک کردار ادا کرتے ہوئے شمالی افریقا کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ نسلی اور امتیازی برتاؤ سے باز رہے، اسی اتحاد کی وجہ سے سوویت یونین ٹکڑے ٹکڑے ہوا اور مشرقی یورپ میں ایک نئی حد بندی ہوئی، یہی اتحاد تھا جس کی وجہ سے لیبیا نے ایٹمی پروگرام کو بغیر کسی چوں چرا کے لپیٹ دیا، یہ واقعات اس بات کی وضاحت کرتے ہیں کہ امریکا نے سوویت یونین کے بجائے اسرائیل کے ساتھ امن معاہدہ کیوں کیا۔ سابق مصری صدر انور السادات نے اس کا بالکل صحیح تجزیہ پیش کیا کہ ’’امریکا شطرنج کے سارے مہرے اپنے ہاتھ میں رکھتا ہے‘‘۔

جب امریکا شام کی طرف آیا تو اس نے اپنے اتحادیوں میں خاص کر کچھ جنگجوؤں کو بھی شامل کیا، امریکا کی شام پالیسی دھند کی لپیٹ میں ہے اس کو سمجھنے کے لیے ہمیں اس سے غرض نہیں ہونی چاہیے کہ وہ کیا حاصل نہیں کرسکا بلکہ امریکا کے حاصل شدہ اہداف اس کی شامی جنگ کی پالیسی کی طرف واضح اشارہ کرتے ہیں۔ حقیقت میں ان اتحادیوں کی اس سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں کہ ان کا اتحاد صرف کاغذی معاہدے تک ہی اپنا وجود رکھتا ہے، اس اتحاد کا حجم بڑھانے کے لیے اس میں شامل ہونے کی شرائط بھی زیادہ پیچیدہ نہیں ہیں، شامی اتحاد میں خامیوں کا مناسب ردعمل اس اتحاد کا ختم ہونا نہیں بلکہ انہیں مزید کچھ کرنے پر اکسانا ہے، مستقبل میں ہمیں اس کی ضرورت پڑے گی۔

مثال کے طور پر علاقائی تحفظ کے حوالے سے ایران کی مداخلت پر خدشات ہیں، صدر ٹرمپ نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ صرف ایران کا ایٹمی پروگرام ہی اس کے پڑوسی ممالک کے لیے پریشان کن نہیں بلکہ اس کی علاقائی تحفظ میں مداخلت بھی ایک بڑا مسئلہ ہے، جیسے کہ ایران کے میزائل پروگرام کے لیے اس کی سرگرمیاں۔ سابق ایرانی صدر احمدی نژاد کے مخالفین نے دنیا کو ایران پالیسی سے خبردار کرتے ہوئے اکٹھا کرلیا، نتیجتاً ایک بڑا اتحاد JCPOA مضبوط مغربی حمایت کے ساتھ سامنے آیا، اسی اتحاد نے ایران کی ایٹمی اور علاقائی پالیسی کی حد بندی کی ہے۔

اب اگر امریکا اس اتحاد کے خلاف جاتا ہے تو یہ ایک آزمائش ہوگی کہ اتحادی یا تو JCPOA کے معاہدے سے وفا کریں یا پھر دنیا کی سب سے بڑی معیشت کا ساتھ دیں یا یہ کہ دنیا کی بڑی اور بے باک ریاست کے خلاف توازن قائم رکھیں، کچھ ممالک امریکا کو معاہدے سے نکلنے کے نقصانات سمجھانے کی کوشش کریں گے، چند ممالک امریکی رویہ سے دلبرداشتہ ہوکر یہ سمجھ جائیں گے کہ امریکا اب دنیا کی قیادت سنبھالنے کے قابل نہیں ہے اور اپنے اپنے مفادات کے مطابق راستہ اختیار کریں گے۔ یہ کہنا بہت آسان ہے کہ کیا کیا غلط ہوسکتا تھا لیکن کیا صحیح ہوسکتا تھا، یہ سوچنا بہت مشکل ہے۔ اگر یہ راستہ غلط ہوتا تو ایران کی ناامید قدامت پسند قیادت اب تک دنیا کی نظروں میں امریکا اور اس کے حواریوں کا اثر ورسوخ گھٹا چکی ہوتی۔

امریکا اور اس کے اتحادی مل کر سب کچھ ٹھیک نہیں کرسکتے، کوئی بھی اتحاد مقصد اور حکمت عملی کا متبادل نہیں ہوسکتا، لیکن مقصد اور حکمت عملی کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایک مضبوط اتحاد تشکیل دیا جاسکتا ہے۔ امریکی خواہشات بہت چھوٹی چھوٹی ہیں، جس کو پورا کرنے کے لیے بڑے بڑے اتحاد بنانے کی ضرورت نہیں۔ اگر امریکا شام کے مسئلے کو حل کرنے میں سنجیدہ ہے تو اسے مقصد کی لگن اور حکمت عملی، دونوں کی ضرورت ہوگی، اس کے بعد حقیقی اتحادی اس میں مددگار ثابت ہوں گے۔

(ترجمہ: سمیہ اختر)

"Alliesand Influence". ("Centre for strategic and international studies". Oct.27, 2017)

امریکا، عراق اور کردوں کے درمیان ثالثی کرا سکتا ہے؟

Max Boot

عراق میں داعش کی وجہ سے افراتفری پھیلی ہوئی ہے، ٹکڑوں میں بٹی ریاست مزید تقسیم ہونے جارہی ہے، کردوں کو نادانستہ طور پر مزید نوازا جارہا ہے، ٹرمپ انتظامیہ عجیب مخمصے میں ہے کہ امریکا کو کرد ریاست قائم کرنے کی طویل تحریک کی حمایت کرنی چاہیے یا مخالفت، کردستان کی علاقائی حکومت پہلے ہی بغداد سے خودمختاری حاصل کرچکی ہے، ۲۰۱۴ء کے بعد سے عراقی فوج کو درپیش حالات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کردستان نے اپنے زیر قبضہ علاقے میں ۴۰ فیصد تک اضافہ کرلیا ہے، کرد حکومت کی جانب سے سب سے اہم قبضہ تیل کی دولت سے مالا مال صوبے کرکوک پر کیا گیا، کرکوک میں طویل عرصے سے کردوں، ترکمانوں اور عربوں کے درمیان صوبے پر کنٹرول کی دوڑ جاری ہے، ۲۵ ستمبر کو کردستان کی علاقائی حکومت نے صدر مسعود بارزانی کی قیادت میں ایک ریفرنڈم کرایا، جس میں ۹۳ فیصد ووٹروں نے عراق سے آزادی حاصل کرنے کے حق میں ووٹ دیا۔ بظاہر ایسا لگتا ہے کہ کرد حکومت نے اپنی حد سے تجاوز کیا، آزادی حاصل کرنے کی کوشش نے اس کے پڑوسیوں عراق، ایران اور ترکی کو اس کے خلاف متحد کردیا، ترکی اور ایران کا کردوں سے پرانا تنازع ہے، انہوں نے کردستان کے ساتھ موجود سرحدی گزرگاہوں کو بند کر کے اپنی ناراضی کا اظہار کردیا ہے، عراقی وزیراعظم حیدر العبادی نے عراقی فوج کو متنازع صوبے کرکوک میں داخل ہوکر کنٹرول سنبھالنے کا حکم دے دیا، اس اقدام میں عراقی وزیراعظم کو ایران کی مدد حاصل تھی، ۱۵، ۱۶/۱۷ اکتوبر کو عراقی فوج ایران کے زیر اثر ملیشیا کے ہمراہ کرکوک شہر اور اطراف کے علاقے میں داخل ہوگئی، تاکہ ان علاقوں میں دوبارہ بغداد کی عملداری قائم کی جاسکے، آپریشن کے اختتام تک عراقی فوج نے ۲۰۱۴ء سے قبل موجود علاقے سے کہیں زیادہ علاقے پر کنٹرول حاصل کرلیا تھا، عراقی فوجی کارروائی کے دوران بہت کم مزاحمت ہوئی، بغداد نے عراقی فوج کے شہر میں داخلے سے قبل کردستان کی اہم سیاسی جماعت پیٹریاٹک یونین آف کردستان سے مذاکرات کیے تھے، کرکوک اور اطراف کے علاقوں میں پی یو کے کے جنگجوؤں کی گرفت بہت مضبوط ہے، پی یو کے دیگر کرد جماعتوں پر اعتماد کرنے کے لیے تیار نہیں، بارزانی کی کرد ڈیموکریٹک پارٹی نے آزادی کے لیے منعقدہ ریفرنڈم کے انتظامات اور مالی وسائل کی فراہمی میں مرکزی کردار ادا کیا۔ پی یو کے کے جنگجوؤں کی بغیر لڑے واپسی کے بعد عراقی فوج اور ڈیموکریٹک پارٹی کے جنگجوؤں میں معمولی جھڑپوں کی اطلاعات تھیں، امریکا کے اتحادیوں کے درمیان اس تصادم نے عجیب تماشے کی صورتحال پیدا کردی، اس سے امریکا کی نازک پوزیشن بھی واضح ہوگئی۔

امریکا کا وفادار اتحادی

کرد سیکولر، مغرب اور امریکا نواز ہیں، یہاں تک کہ وہ اسرائیل کی خاموش حمایت بھی کرتے ہیں، کرد حکومت مشرق وسطیٰ میں امریکا کے سب سے زیادہ قابل اعتماد اتحادیوں میں سے ایک ہے، یہ جمہوری حکومت نہیں ہے، بارزانی ۲۰۱۵ء میں اپنی حکومت کی مدت کے خاتمے کے باوجود مسلسل حکومت کرتے چلے جارہے ہیں، ان کی حکومت کو کرپشن اور سیاسی جماعتوں کے درمیان اقتدار کے لیے لڑائی کا سامنا ہے، سیاسی تقسیم کے باوجود کردستان کو اہم سیاسی اور اقتصادی کامیابیاں حاصل ہوئی ہیں، اس کے برعکس بغداد حکومت نااتفاقی، بدانتظامی اور کرپشن میں گھری ہوئی ہے، ایرانی حمایت یافتہ بغداد حکومت پر شیعہ جماعتوں کا غلبہ ہے، عراق میں امن اور استحکام قائم ہونے کی امید پر صدام کے بعد آنے والے حکمرانوں کی واشنگٹن مدد کرتا رہا ہے، اوپیک تنظیم میں عراق تیل پیدا کرنے والا دوسرا بڑا ملک ہے، سابق صدر جارج ڈبلیو بش کے دور میں امریکی انتظامیہ عراق کو سنی اور شیعہ انتہاپسندی کے خلاف دفاعی دیوار بنانا چاہتی تھی، جس میں ان کو محدود کامیابی بھی حاصل ہوئی، ۲۰۱۴ء میں داعش کے حملے کے سامنے جب عراقی فوج بُری طرح ڈھیر ہوگئی تو امریکا نے ایرانی مدد سے عراقی فوج کو دوبارہ سے داعش سے مقابلے کے لیے کھڑا کیا، جس کے بعد پاپولر موبلائزیشن فورس طاقتور ملیشیا بن کر ابھری، اس ملیشیا کا ایک پاؤں حکومت میں اور دوسرا باہر تھا، امریکا کی طویل مدتی پالیسی عربوں اور کردوں کے درمیان پل کا کردار ادا کرنے کی ہے، ایک طرف امریکا نے کردوں پر زور دیا کہ وہ عراق سے آزادی حاصل کرنے کا اعلان نہ کریں اور دوسری طرف عراق پر دباؤ ڈالا کہ کردوں کے خلاف طاقت کا استعمال نہ کیا جائے، یہ پالیسی اب ناکام ہوچکی ہے، امریکا اب بھی اس معاملے میں غیر جانبداری برقرار رکھ سکتا ہے، وہ کردوں کی حمایت یا مخالفت میں بھی پالیسی بنا سکتا ہے، کردوں کی حمایت کرنے کی بہت مضبوط تاریخی، اخلاقی اور اسٹریٹجک وجوہات ہیں، یہ دنیا میں سب سے بڑا نسلی گروہ ہے جس کے پاس اپنی کوئی ریاست موجود نہیں ہے، (ساڑھے تین کروڑ کرد دنیا بھر میں موجود ہیں)، کردوں کو اقلیت کے طور پر شدید ظلم کا نشانہ بنایا گیا ہے، ۱۹۹۲ء میں کے آر جی کے قیام کے بعد سے عراقی کردوں نے واشنگٹن کے ساتھ زبردست دوستانہ رویہ رکھا ہے، امریکا اور ترکی کے درمیان تعلقات خراب ہونے کے بعد کرد حکومت نے واشنگٹن کو متبادل ہوائی اڈے فراہم کرنے کی پیشکش کردی، جس کو امریکا نے شام میں اہم فوجی کارروائیوں کے لیے استعمال کیا، کرد حکومت زیادہ سے زیادہ تعداد میں امریکی فوجیوں کی میزبانی کی خواہش کا اظہار کرچکی ہے، کرد حکومت کے علاقے میں امریکی آپریشن پر کسی قسم کی پابندی کا کوئی امکان نہیں، اربیل ایئرپورٹ پہلے ہی داعش کے خلاف امریکا اور اس کے اتحادیوں کی کارروائیوں کا سب سے بڑا مرکز ہے۔

آزادی حاصل نہ کرنے کی وجوہات

کرد عوام کی اکثریت ریاست کی مستحق ہے لیکن آزادی کا اعلان ملتوی کرنے کی بہت مضبوط وجوہات ہیں، کرد حکومت کو پہلے ہی کافی حد تک خودمختاری حاصل ہے، جو درحقیقت آزادی کے قریب ہے، کردوں کے پاس اپنی حکومت، فوج، زبان اور جھنڈا موجود ہے، لیکن پھر بھی بارزانی نے نتائج کی پروا کیے بغیر ہی مکمل آزادی حاصل کرنے کے عمل کو تیز کردیا ہے، ایک حد تک اس سے بارزانی کا مقصد اپنی سیاسی حیثیت کو تحفظ دینے کے ساتھ کے ڈی پی کو مخالفین کے مقابلے میں سیاسی فائدہ پہنچانا تھا۔ عراق، ایران اور ترکی کی مخالفت کرد حکومت کو بڑا نقصان پہنچا سکتی ہے، ترکی کرد حکومت کا اہم تجارتی اتحادی ہے، کردستان انقرہ کی تیسری بڑی برآمدی مارکیٹ ہے، مکمل آزادی حاصل کرنے کے لیے ترکی سے تعلقات خطرے میں ڈالنا کرد حکومت کی بیوقوفی ہوگی، کرد عراقی حکومت کے ساتھ بہتر تعلقات قائم رکھ کر اس کی پالیسیوں پر اثر انداز ہوسکتے ہیں، کرد افسران مرکزی حکومت میں اعلیٰ عہدے حاصل

کرسکتے ہیں، حقیقت میں یہ ایک اعتدال پسند راستہ ہے، (اس وقت بھی عراقی پارلیمان کی ۳۲۸ نشستوں میں سے ۶۲ نشستیں کردوں کے پاس ہیں)۔ امریکا کو کرد حکومت کی آزادی کے اعلان کی حمایت کے بجائے بوسنیا طرز کی کنفیڈریشن کی حمایت کرنی چاہیے، یہ ایسا حل ہے جس کی حمایت ماضی میں بارزانی بھی کرچکے ہیں، اربیل اور بغداد حکومت کے درمیان مذاکرات کے بعد دونوں کو اسی نتیجے پر پہنچنا چاہیے، لیکن کرد صحافی محمد صالح کا کہنا ہے کہ ''کردوں کو بغداد کی مداخلت کے بغیر اپنا تیل اور گیس فروخت کرنے کی آزادی، عراق کی فوج میں مناسب حصہ اور خارجہ معاملات پر بااختیار بنا کر مسئلہ حل کیا جاسکتا ہے مگر یہ حل ناممکن لگتا ہے کیونکہ بیرون ملک موجود کردوں کے نمائندوں کو سفارتی حیثیت تک حاصل نہیں''۔ بغداد میں موجود کچھ شیعہ گروپوں نے اس طرح کے کسی حل کے لیے تیار رہنے کا اشارہ دیا ہے، کیونکہ اس سے ان کو غیر کرد علاقوں پر اپنا کنٹرول مضبوط کرنے کا موقع مل جائے گا، مذاکرات میں مالی وسائل اور علاقے کی تقسیم پر بات چیت کافی مشکل مرحلہ ہوگا، مثال کے طور پر کرکوک اور نینوا صوبے پر بغداد اور اربیل دونوں کا دعویٰ ہے، کردوں کی حیثیت کا تعین قانونی ریفرنڈم کے ذریعے ہی کیا جانا چاہیے لیکن ایسا مستقبل قریب میں ہوتا نظر نہیں آتا، اعتماد سازی کے اقدامات کے طور پر کچھ علاقوں سے کرد فوجوں کو نکالنے اور کچھ علاقوں کو مشترکہ طور پر کنٹرول کرنے کا سمجھوتا کیا جاسکتا ہے۔

واشنگٹن کا کردار

اربیل اور بغداد کے درمیان مذاکرات کی کامیابی کے لیے نیک نیت اور طاقتور ثالث کا ہونا بہت ضروری ہے، اسی لیے امریکا ثالثی کا کردار ادا کرنے کے لیے منفرد حیثیت رکھتا ہے، کیونکہ عراق میں امریکی فوجیوں کی مخصوص تعداد (پانچ ہزار) کی موجودگی اسے قابل اعتبار بناتی ہے اور امریکا اس مسئلے کے حل کے لیے اچھی سفارتکاری بھی کرسکتا ہے۔ موجودہ بحران بروقت اقدامات نہ کرنے کی وجہ سے پیدا ہوا، کیونکہ امریکا داعش کیخلاف جنگ میں بری طرح الجھا ہوا ہے، جب ٹرمپ حکومت نے کردوں کے مسئلے پر توجہ دینی شروع کی اور امریکی وزیر خارجہ ریکس ٹیلرسن نے آزادی کے ریفرنڈم کی منسوخی کے لیے کردوں سے رابطہ کیا تو ان کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑا، بہرحال اب آگے بڑھنا چاہیے، کشیدگی کے خاتمے، عراقی اور کرد فوجوں کے درمیان تعاون کے فروغ کے لیے امریکی فوجیوں کو سہولت کار کا کردار ادا کرنا چاہیے، امریکی سفارت کار اربیل اور بغداد میں سمجھوتا کرانے کے لیے مرکزی کردار ادا کریں، اگر دونوں میں سے کوئی بھی سمجھوتے سے انکار کرے تو امریکا فوجی امداد روک کر اپنی بات منوا سکتا ہے، اس دوران اگر عراقی فوج اربیل اور دیگر اہم کرد صوبوں میں گھسنے کی کوشش کرتی ہے تو امریکی فوج کرد فوج کی مدد کرے گی، امریکی وزیر خارجہ ریکس ٹیلرسن کی کرد مسئلے کو حل کرانے کی صلاحیت پر شبہ ہے، کیونکہ حال میں ٹیلرسن نے صدر ٹرمپ کی جانب سے خود کو بری طرح ذلیل کرنے کی خبروں کی سختی سے تردید کی ہے، اربیل اور بغداد میں سمجھوتا کرانے کے لیے امریکا کو خصوصی سفارت کار نامزد کرنا چاہیے، اس حوالے سے ریٹائرڈ جنرل ڈیوڈ پیٹریاس، ریمنڈ ٹی یا سابق سفیر کروکر کو نامزد کیا جاسکتا ہے، امریکا کے لیے سب سے کم برا یہ ہوسکتا ہے کہ موجودہ صورتحال برقرار رہے اور کرد حکومت کی خودمختاری کی ضمانت دیتے ہوئے عراق کو متحد رکھا جائے، اس سے بغداد اور اربیل کے کسی حتمی سمجھوتے تک پہنچنے کا راستہ ہموار ہوجائے گا، ورنہ اس کا نتیجہ غیر ضروری خون خرابے کی شکل میں نکل سکتا ہے۔ (ترجمہ: سید طالوت اختر)

"Can the United States broker peace between Iraq and the Kurds?" ("cfr.org". October 17, 2017)

بقیہ: مشرقِ وسطیٰ۔ وَرَق پھر اُلٹ رہا ہے!

اگر اِس فہرست میں سعودی عرب، ترکی، پاکستان، تیونس، نائیجیریا، الجزائر یا کسی کا بھی اضافہ ہوجائے، تو دین وملت کو کیا فائدہ پہنچے گا؟؟؟

۱۹) صورتحال پر، ہم اپنے غصّے یا فرسٹیشن کا اظہار، ضرور کریں۔ مگراً حوالِ جہاں، اپنے اِرد گرد کے زمینی حقائق اور چاروں طرف پھیلی ''بارودی سُرنگوں'' کو بھی پیشِ نظر رکھیں۔ اِنہیں ہرگز نظرانداز نہ کریں۔ ہم سب کی کوشش ہونی چاہیے کہ سب سے پہلے تو اپنی شریانوں سے بہتے لہو کو روکیں۔۔۔ اپنے کمروں اور باورچی خانے سے اُٹھتے شعلوں کو سرد کریں۔۔۔ اور اپنے ملکوں کو بطور ''پنچنگ بیگ'' استعمال نہ ہونے دیں۔

الٰہی! ہم پر، اپنے کمزور بندوں پر۔۔۔ اپنے نام لیوا بےعمل اور بدعمل مسلمانوں پر۔۔۔ اب رحم فرما، کرم فرما۔۔۔ راہِ نجات دِکھا۔۔۔ اُس پر چلنے ہی کی نہیں، چلانے کی بھی صلاحیت وفراست، عزم وہمت اور سلیقہ وتوفیق دے۔ آمین، یاارحم الرّاحمین!

I I I

بقیہ: سعودی ولی عہد: طاقت کا خطرناک کھیل

سعودی ولی عہد کو ٹرمپ اور ان کے بااعتماد حلقے کی مضبوط حمایت حاصل ہے، جو سعودی ولی عہد شہزادہ محمد بن سلمان کو ایک اصلاح پسند سمجھتے ہیں۔ یہ محض اتفاق نہیں کہ گزشتہ ماہ ٹرمپ کے سینئر مشیر اور داماد Jared Kushner نے ریاض کا نجی دورہ کیا اور دونوں نے کئی راتیں اکٹھے بسر کیں، جن کے دوران انہوں نے ایک دوسرے کو اپنی داستانیں سنائیں اور مستقبل کی منصوبہ بندی کی۔ سعودی ولی عہد شہزادہ محمد بن سلمان کو بجا طور پر سعودی ٹرمپ کہا جاسکتا ہے، لیکن چینی صدر شی جن پنگ کی طرف سے بدعنوانی کے خلاف مہم سعودی ولی عہد شہزادہ محمد بن سلمان کے لیے مثال ثابت ہوسکتی ہے۔

"The Saudi crown prince just made a very risky power play". ("Washington Post". Nov.5, 2017)

I I I

بقیہ: لبنان: سعودی عرب کا اگلا یمن؟

اختیار کریں گے۔ حزب اللہ سے جنگ کی صورت میں سعودی عرب کے حامی ہتھیار اٹھا کر میدان میں آئیں گے یا نہیں؟ اور ایسا بھی نہیں ہے کہ لبنان میں حزب اللہ کے لیے سب کچھ اچھا ہے۔ وہ اب لبنان کی حدود سے باہر ایسا کچھ بھی کرنے کی پوزیشن میں نہیں، جس سے سعودی عرب اور اس کے حلیف برہم ہوں۔ اگر ایسی کوئی بھی کیفیت پیدا ہوئی تو سعودی عرب اپنے اتحادیوں کے ساتھ مل کر لبنان میں حزب اللہ کے خلاف بھرپور کارروائی سے گریز نہیں کرے گا۔

ایک بات تو بالکل واضح ہوچکی ہے، وہ یہ کہ لبنان کے عوام فی الحال کسی بھی جنگ یا خانہ جنگی کا حصہ نہیں بننا چاہتے۔ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس کے نتیجے میں صرف خرابیاں پیدا ہوں گی اور معاملات الجھیں گے۔ وہ حزب اللہ سے کوئی ایسی لڑائی نہیں چاہتے جس کے نتیجے میں ملک مزید خرابیوں کا شکار ہو۔ ساتھ ہی ساتھ وہ اپنی سرزمین پر کسی اور کی جنگ بھی نہیں چاہتے۔ ۱۹۷۵ء سے ۱۹۹۰ء کی خانہ جنگی کافی تھی۔ اسرائیل سے مناقشے بھی مسائل پیدا کرتے رہے ہیں۔ قتل و غارت بہت ہوچکی۔ اب دانش سے کام لینے کا وقت ہے۔

(ترجمہ: محمد ابراہیم خان)

"Will Lebanon become Saudi's next Yemen?". ("Al Jazeera". Nov.12, 2017)

I I I

اعلانِ بَیلفور کے ۱۰۰ سال

Zena Tahhan

۲ نومبر کو اعلانِ بَیلفور (Balfour Declaration) کے ۱۰۰ سال مکمل ہوگئے۔ اس اعلان نے صہیونیت کی بنیاد پر یہودیوں کی ایک ریاست کے قیام کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ یہودیوں کے لیے ان کی اپنی آبائی سرزمین پر ایک ریاست کو معرض وجود میں لانے کا عہد برطانیہ نے کیا۔

اس عہد پر عمل کے نتیجے ہی میں ۱۹۴۸ء میں فلسطینیوں کی نسلی تطہیر ہوئی اور اسرائیل دنیا کے نقشے پر ابھرا۔

اعلانِ بَیلفور کو جدید عرب تاریخ میں انتہائی متنازع دستاویزات میں شمار کیا جاتا ہے اور تاریخ دانوں کو اس دستاویز نے عشروں تک خلجان میں مبتلا رکھا ہے۔

اعلانِ بَیلفور ہے کیا؟

اعلانِ بَیلفور دراصل برطانیہ کی طرف سے کیا جانے والا عہد تھا کہ وہ فلسطین میں یہودیوں کے لیے ایک ریاست قائم کرے گا۔ یہ عہد اس وقت کے برطانوی وزیر خارجہ آرتھر بَیلفور نے ایک خط میں کیا تھا، جو برطانیہ میں یہودی کمیونٹی کے سربراہ لاینول والٹر روتھس چائلڈ کے نام لکھا گیا تھا۔ یہ خط پہلی جنگ عظیم کے دوران لکھا گیا تھا اور برطانیہ کے فلسطینی مینڈیٹ اور خلافتِ عثمانیہ کے خاتمے کی شرائط میں شامل کردیا گیا تھا۔ اس وقت کی بڑی (یورپی) قوتوں نے مینڈیٹ سسٹم کے زیرعنوان استعماریت اور نوآبادی نظام کا ڈھانچا تیار کیا تھا، جس کا بنیادی مقصد کمزور اقوام کو آپس میں تقسیم کرنا تھا۔ پہلی جنگ عظیم میں شکست کھا جانے والی قوتوں (جرمنی، آسٹرو ہنگیرین ایمپائر، خلافتِ عثمانیہ اور بلغاریہ) کے زیر قبضہ علاقوں کو فاتحین کے حوالے کیا جانا تھا۔

مینڈیٹ سسٹم کے تحت نئی ابھرنے والی ریاستوں کا نظم و نسق (جب تک وہ اپنے پیروں پر کھڑی نہ ہوجائیں) جنگ میں فتح پانے والی اقوام کے حوالے کیا گیا۔ فلسطین کا معاملہ البتہ مختلف تھا۔ برطانیہ نے فلسطینی علاقوں میں یہودیوں کے لیے قومی ریاست قائم کرنے کا فیصلہ کیا جبکہ اس وقت وہاں یہودیوں کی آبادی ۱۰ فیصد سے بھی کم تھی۔

۱۹۲۲ء سے ۱۹۳۵ء کے درمیان برطانیہ نے یورپی یہودیوں کو فلسطین میں بسانا شروع کیا اور پھر وہاں یہودیوں کی آبادی ۹ فیصد سے ۲۷ فیصد تک جا پہنچی۔ اعلانِ بَیلفور میں رسمی طور پر یہ وعدہ کیا گیا تھا کہ فلسطین میں آباد غیر یہودی آبادیوں کے شہری اور مذہبی حقوق کو کسی بھی صورت داؤ پر نہیں لگنے دیا جائے گا، تاہم حقیقت یہ ہے کہ یہودیوں کو وہ سب کچھ دیا گیا جس کی بنیاد پر وہ دوسروں کو نیچا دکھا کر اپنی مرضی سے کھیل سکیں۔

اعلانِ بَیلفور بہت سی وجوہات کی بنیاد پر متنازع تھا۔

☆ عظیم فلسطینی دانشور ایڈورڈ سعید کے مطابق یہ ایک غیر یورپی سرزمین کا معاملہ تھا، جس کا فیصلہ ایک یورپی طاقت نے کیا اور ایسا کرتے وقت مقامی اکثریتی آبادی کی امنگوں کو یکسر نظرانداز کردیا گیا۔ یہودیوں کے لیے ایک ایسی سرزمین پر قومی ریاست کے قیام کا وعدہ کیا گیا جہاں مقامی آبادی ۹۰ فیصد سے زائد اکثریت رکھتی تھی۔

☆ یہ اعلان ان تین غلط وعدوں میں سے تھا جو برطانوی سلطنت نے حالتِ جنگ میں کیے تھے۔ جب یہ اعلان کیا گیا تب برطانوی حکمران اہلِ عرب سے وعدہ کرچکے تھے کہ ۱۹۱۵ء کی حسین میک میہون خط و کتابت کی بنیاد پر انہیں سلطنتِ عثمانیہ سے آزادی دلائیں گے۔ برطانوی قیادت ۱۹۱۶ء کے سائکس پائیکوٹ معاہدے کے ذریعے فرانس سے وعدہ کرچکی تھی کہ فلسطینی علاقہ بین الاقوامی انتظامیہ کے تحت رکھا جائے گا۔ جبکہ خطے کے دیگر علاقے یا ممالک کو فرانس اور برطانیہ آپس میں تقسیم کرلیں گے۔ اعلانِ بَیلفور سے یہ بات طے ہوگئی کہ فلسطینی برطانوی انتظام کے تحت آجائیں گے اور وہاں آباد عربوں کو آزادی نہیں ملے گی۔

سب سے بڑھ کر یہ کہ اعلانِ بَیلفور میں ’’نیشنل ہوم‘‘ کے الفاظ شامل تھے، جن کا اس وقت تک بین الاقوامی قوانین میں کوئی ذکر نہ تھا۔ ’’ریاست‘‘ کے بجائے یہودیوں کے لیے ’’قومی گھر‘‘ کی اصطلاح خاصی ڈھیلی ڈھالی تھی، جس کے مختلف مفاہیم اخذ کیے جاسکتے تھے۔ ابتدائی مسودوں میں یہ درج تھا کہ فلسطینی علاقوں کو نئی شکل دے کر یہودی ریاست میں تبدیل کیا جائے گا۔ بعد میں یہ الفاظ حذف کرکے ’’نیشنل ہوم‘‘ کی اصطلاح شامل کی گئی۔

۱۹۲۲ء میں صہیونی لیڈر حائم وائزمین سے ملاقات کے بعد آرتھر بَیلفور اور اس وقت کے برطانوی وزیراعظم ڈیوڈ لائڈ جارج نے کہا کہ اعلانِ بَیلفور کا حتمی مقصد یا ہدف یہودی ریاست کا قیام ہی ہے۔

ایک اہم سوال یہ ہے کہ اعلانِ بَیلفور جاری ہی کیوں کیا گیا؟ اس سوال پر تاریخ دانوں اور تجزیہ کاروں نے عشروں تک بحث کی ہے۔ اور مختلف پہلو تراشنے کی کوشش کی ہے۔

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اس وقت کی برطانوی قیادت میں صہیونی بھی تھے، جو چاہتے تھے کہ دنیا بھر کے یہودیوں کو ایک مرکز پر لایا جائے۔ دوسری طرف بعض لوگوں کی رائے یہ تھی کہ یورپ میں یہودیوں سے شدید نفرت پائی جاتی تھی اور اس کا حل یہ سوچا گیا کہ فلسطینی سرزمین پر یہودی ریاست قائم کردی جائے تاکہ یہودی مخالف لہر دم توڑ دے یا اس کی شدت میں کمی آجائے۔

آراء تو اور بھی بہت سی ہیں، مگر مرکزی دھارے کے اسکالر جن آراء پر متفق دکھائی دیتے ہیں وہ یہ ہیں:

☆ فلسطین میں یہودی ریاست کے قیام کی صورت میں اس پورے علاقے پر برطانوی کنٹرول یقینی بنانا تاکہ مصر اور سوئیز کینال پر اپنا تصرّف برقرار رکھا جاسکے۔

☆ برطانیہ کو یہودیوں کا ساتھ دینا ہی تھا تاکہ امریکا اور روس میں یہودی لابیاں حتمی فتح تک دوسری عالمی جنگ میں برطانوی افواج کو ثابت قدم رہنے کے قابل بنانے میں بھرپور مالی معاونت کرسکیں۔

☆ برطانیہ اور برطانوی حکومت میں صہیونی لابی بہت مضبوط تھی۔ برطانوی حکمرانوں میں صہیونیوں کے رابطے اور اثرات غیر معمولی تھے اور وہ بہت سے اہم فیصلوں پر اثرانداز بھی ہوتے تھے۔ بہت سے برطانوی اعلیٰ حکام بھی صہیونی تھے۔

☆ یورپ بھر میں یہودیوں پر مظالم ڈھائے جارہے تھے اور برطانوی حکومت ان سے ہمدردی کے اظہار کے طور پر ان کے لیے ریاست کا قیام چاہتی تھی۔

اب یہ دیکھنا ہوگا کہ فلسطینیوں اور عربوں نے اعلانِ بَیلفور پر کس نوعیت کا ردعمل ظاہر کیا؟ ۱۹۱۹ء میں اس وقت کے امریکی صدر ووڈرو ولسن نے شام اور فلسطین میں مینڈیٹری سسٹم کے حوالے سے رائے عامہ کا جائزہ لینے کے لیے ایک کمیشن قائم کیا۔ اسے کنگ کرین کمیشن کا نام دیا گیا۔ کمیشن نے تحقیقات کے بعد بتایا کہ فلسطینیوں کی اکثریت صہیونیت کے خلاف ہے

اور مینڈیٹ کے اہداف کے حوالے سے نئے سرے سے غور و خوض کے ذریعے بہت کچھ دوبارہ طے کرنا پڑے گا۔

معروف قوم پرست فلسطینی سیاست دان عونی عبدالہادی مرحوم نے اعلانِ بالفور پر شدید نکتہ چینی کرتے ہوئے کہا کہ یہ دستاویز ایک انگریز نے تیار کی ہے، جس کا فلسطین سے کوئی تعلق نہیں اور یہ دستاویز ایک ایسے یہودی کے لیے تیار کی گئی ہے جس کا فلسطینی علاقے پر کوئی حقِ ملکیت نہیں۔

۱۹۲۰ء میں حیفہ میں منعقدہ تیسری فلسطینی کانگریس نے اعلانِ بالفور کو یہ کہتے ہوئے مسترد کردیا کہ یہ صہیونیت کی واضح حمایت کرتا ہے اور مقامی آبادی کے حقوق کی ضمانت فراہم کرنے والے بین الاقوامی قوانین کے یکسر منافی ہے۔

پریس کے ذریعے اعلانِ بالفور کے بارے میں مزید بہت سی آراء سامنے آسکتی تھیں مگر پہلی جنگ عظیم کے آغاز ہی میں سلطنتِ عثمانیہ نے اس پر پابندی لگادی تھی۔ ۱۹۱۹ء میں پریس کو بحالی کا موقع ملا، تاہم اس بار برطانوی ملٹری سینسر شپ بنیادی شرط کے طور پر ساتھ تھی۔

نومبر ۱۹۱۹ء میں شام کے دارالحکومت دمشق سے عربی روزنامہ ''الاستقلال العربی'' کی اشاعت دوبارہ شروع ہوئی تو برطانوی کابینہ کے صہیونی وزیر ہربرٹ سیموئل کی طرف سے اعلانِ بالفور کی بھرپور حمایت کے جواب میں اخبار نے ایک مضمون میں صاف صاف لکھا کہ ہمارا ملک عرب ہے، فلسطین عرب ہے اور یہ عرب ہی رہے گا۔

اعلانِ بالفور اور برطانوی مینڈیٹ کے سامنے آنے سے پہلے بھی عرب دنیا کے بیشتر اخبارات خبردار کرچکے تھے کہ صہیونیت کو فروغ دینے اور فلسطینیوں کو ان کے علاقوں سے نکالنے کے سنگین نتائج برآمد ہوں گے۔ پہلی جنگِ عظیم کے خاتمے پر مقبوضہ بیت المقدس کے استاد اور مصنف خلیل سکاکینی نے لکھا ''جو قوم ایک مدت سے سوئی ہوئی ہو وہ حالات کے ہاتھوں بری طرح جھنجھوڑے جانے پر بیدار ضرور ہوتی ہے، مگر مرحلہ وار۔ یہ تھی فلسطین کی حالت جو صدیوں سے سویا ہوا تھا۔ ایک عظیم جنگ نے اِسے جگادیا۔ صہیونیت نے اِسے چونکایا اور برطانیہ کی غیر منصفانہ پالیسیوں نے اِسے بیدار ضرور کیا مگر مکمل طور پر نہیں''۔

برطانیہ اور دیگر یورپی طاقتوں کی شہہ پر جب یورپ کے یہودیوں نے فلسطین میں آباد ہونا شروع کیا، تب صورتِ حال کشیدہ ہونے لگی۔ ۱۹۲۰ء میں نبی موسیٰ ریوالٹ کی شکل میں فلسطینیوں کا پہلا شدید ردعمل سامنے آیا۔ اس واقعے میں چار فلسطینی اور پانچ یورپی یہودی مارے گئے۔

اور کون کون پشت پر تھا؟

عام طور پر یہ تصور کیا جاتا ہے کہ اعلانِ بالفور برطانوی سلطنت نے جاری کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ جنگ میں اس کے دیگر بڑے اتحادیوں کے مشوروں اور اجازت کے بغیر یہ اعلان ممکن نہیں ہوسکتا تھا۔ ستمبر ۱۹۱۷ء میں برطانیہ کی جنگی کابینہ کے ایک اجلاس میں طے کیا گیا کہ باضابطہ ڈکلیریشن سے قبل اس وقت کے امریکی صدر ووڈرو ولسن سے بھی منظوری لینا درست ہوگا۔ ۴/اکتوبر کو برطانوی کابینہ نے آرتھر بالفور کو یاد دلایا کہ معاہدہ کے لیے امریکی صدر کی بھرپور حمایت ہر حال میں یقینی بنائی جائے۔

فلسطینی علاقوں میں دنیا بھر کے یہودیوں کو آباد کرنے کے اس منصوبے کو فرانس کی بھی حمایت حاصل تھی۔ مئی ۱۹۱۷ء میں فرانسیسی سفارتکار جولے کیمبون نے پولینڈ کے صہیونی لیڈر ناہم سوکولو کے نام خط میں لکھا کہ فرانسیسی حکومت فلسطینی علاقوں میں یہودیوں کی آبادکاری کے اس منصوبے کی بھرپور حمایت کرتی ہے۔ خط میں مزید درج تھا کہ یہودیوں کو جن علاقوں سے صدیوں پہلے نکال دیا گیا تھا انہیں وہاں دوبارہ آباد کرنا دراصل یہودی قوم پرستی کے احیا میں بھرپور معاونت اور انصاف کا بول بالا کرنے جیسا اقدام ہوگا اور اس حوالے سے اتحادی برطانیہ کے شانہ بہ شانہ کھڑے ہوں گے۔ زبان وبیان کے اعتبار سے اس خط کو اعلانِ بالفور کا ''نقیب'' قرار دیا جاسکتا ہے۔

اعلانِ بالفور کے فلسطینیوں پر اثرات

اعلانِ بالفور کو بیشتر فلسطینی ۱۹۴۸ء میں رونما ہونے والے ''نکبہ'' کا نقیب قرار دیتے ہیں، جب برطانیہ کی بھرپور حمایت سے تربیت یافتہ صہیونیوں کے مسلح گروپوں نے ۷۵ ہزار سے زائد فلسطینیوں کو ان کی آبائی زمین سے بے دخل کردیا تھا۔ جنگی کابینہ کے چند ایک ارکان نے اعلانِ بالفور کے سنگین نتائج سے خبردار کیا تھا، مگر اس کے باوجود برطانوی قیادت نے یہ اعلان ضروری سمجھا اور جو فیصلہ کرلیا تھا اس پر عمل کردکھایا۔

اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ یہودیوں کو غیر معمولی قوت اور تیزی کے ساتھ فلسطینی علاقوں میں قدم جمانے کا موقع فراہم کرنے میں برطانوی قیادت نے کلیدی کردار ادا کیا۔ اور اسی کے نتیجے میں ۱۹۴۸ء میں یہودی ریاست کا قیام عمل میں آیا۔ سوال صرف یہودیوں کو ریاست کا حق دینے کا نہیں تھا، اصل مسئلہ یہ ہے کہ اس حق کا دیا جانا یقینی بنانے کے عمل میں فلسطینی اپنے ہی آبائی علاقوں سے بے دخل کردیے گئے۔ ۱۹۴۷ء میں برطانیہ نے مینڈیٹ سسٹم ختم کرکے فلسطین کا معاملہ اقوام متحدہ کے حوالے کیا، مگر تب تک برطانیہ کی بھرپور حمایت سے صہیونیوں کے مسلح گروپ منظّم فوج کی شکل اختیار کرچکے تھے۔ ان گروپوں کو برطانوی فوج کے شانہ بہ شانہ لڑنے کا تجربہ بھی حاصل تھا۔ قصہ مختصر، برطانیہ نے یہودیوں کو فلسطینی علاقوں میں خودمختاری کے حصول کے قابل بنانے میں بھرپور معاونت کی۔ قدم قدم پر حوصلہ افزائی کی گئی اور دوسری طرف فلسطینیوں کو خودمختاری کے حصول سے روکا گیا۔ اس کے نتیجے میں یہودیوں کے ہاتھوں فلسطینیوں کی نسلی تطہیر کی راہ ہموار ہوئی۔ (ترجمہ: محمد ابراہیم خان)

"100 years on: The Balfour Declaration explained". ("Al-Jazeera". Oct. 29, 2017)

بقیہ: جرمنی میں مذہب اور لادینی ریاست

مذہب اور ریاست کے تعلقات پر جرمنی میں حالیہ مباحث کے دوران اندازہ ہوا کہ مذہب کو نجی معاملہ قرار دینے اور مذہبی امور میں ریاست کی غیر جانبداری کے رجحان میں اضافہ ہورہا ہے اور یہ امور مذہب کی آئینی حیثیت کے مرکزی عناصر بن گئے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ریاست کے اندر مذہب کے عوامی کردار کی اہمیت کو کم سمجھا اور بیان کیا گیا ہے۔ یہ نقطہ نظر اس تعمیری کردار سے چشم پوشی کے مترادف ہے جسے جرمن طرزِ معاشرت نے گزشتہ عرصے میں جنم دیا ہے۔ اس سے بھی افسوسناک بات یہ ہے کہ اس طرزِ معاشرت کے مستقبل کے امکانات کے بارے میں بھی غلط فہمیاں ہیں۔ حتیٰ کہ مختلف مذاہب پر مبنی جدید معاشرے میں مذہب کا محض انفرادی تصور ناکافی ہے۔ یہ بات اس عملی تصور کے خلاف ہوگی جو مذہب نہ صرف افراد کے لیے رکھتا ہے، بلکہ پورے معاشرے اور اس کے ثقافتی عوام کے لیے بھی۔ مزید برآں مذہبی عقائد کی انفرادی اقسام پر زور عیسائی روایت میں تو ہوسکتی ہے، لیکن اس میں دیگر مذاہب کے تصور کو نظرانداز کردیا گیا، جن میں اجتماعی پہلو پر زیادہ توجہ دی گئی ہے۔ اس کے برخلاف جرمن طرزِ معاشرت دوہری خصوصیت کا حامل ہے۔ یعنی وہ انفرادی بنیادی حقوق کی بھی ضمانت دیتا ہے اور مذہبی گروہوں سے تعاون کے عمل کے ذریعے انفرادیت کے ساتھ ساتھ سماجی عوامل میں مذہبی تقاضوں کو بھی پورا کرتا ہے۔

(بشکریہ: علمی و تحقیقی مجلّہ ''مغرب اور اسلام'' اسلام آباد۔ شمارہ ۴۴)

جرمنی میں مذہب اور لادینی ریاست

Stefan Korioth - Aino Oxblod

سماجی منظر نامہ

وفاقی جمہوریہ جرمنی میں بالعموم ریاست اور مذہب کے باہمی تعلقات اور اس کی قانونی اساس کا بالخصوص خاکہ بیان کرنے کے لیے ہم ان روابط کے سماجی تناظر کے حوالے سے چند تعارفی کلمات سے بات شروع کرتے ہیں۔ گزشتہ ساٹھ برس کے دوران بنیادی سماجی صورتحال میں ڈرامائی تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں۔ ۱۹۵۰ء میں وفاقی جمہوریہ جرمنی کی ۹۶ فیصد سے زائد آبادی کسی ایک بڑے عیسائی فرقے سے تعلق رکھتی تھی۔ تقریباً ۵۰ فیصد پروٹسٹنٹ اور تقریباً ۴۶ فیصد رومن کیتھولک تھے۔ ۱۹۶۰ء کے عشرے کے آغاز تک اس صورتحال میں کوئی خاص فرق نہیں آیا تھا۔ تاہم اس کے بعد عیسائی فرقوں کا زوال شروع ہوا اور چرچ سے قطع تعلق کرنے والوں کی تعداد بڑھتی چلی گئی۔

حقیقت یہ ہے کہ لادینیت کا یہ بڑھتا ہوا رجحان اور گرجا گھروں سے دوری کا عمل پوری مغربی دنیا میں جاری تھا۔ (غالباً واحد اہم استثنا صرف ریاست ہائے متحدہ امریکا ہی تھا) لیکن جرمنی کے خصوصی حوالے سے دیکھا جائے تو اس کا ایک اور اہم پہلو بھی لائق توجہ ہے۔ ۱۹۴۹ء سے ۱۹۶۰ء تک جرمنی کا جغرافیائی اور نظریاتی طور پر دو مختلف ریاستوں میں تقسیم رہنا۔ جرمنی کا بنیادی اور اساسی قانون Grundgesetz ہے۔ یہ قانونی ڈھانچا مذہب اور مذہبی گروہوں کے لیے مضبوط حمایت کا حامل ہے۔ اس کے برعکس عوامی جمہوریہ جرمنی میں سوشلسٹ حکومت نے دانستہ طور پر مذہب دشمن راہ اختیار کی۔ سوشلسٹ ریاست کی دیگر کوششوں کے برخلاف ان کی الحادی مہم نمایاں طور پر کامیاب رہی۔ چنانچہ جب سوشلسٹ نظام کا انہدام ہونے پر دونوں جرمن ریاستیں یکجا ہوئیں تو عوامی جمہوریہ جرمنی کی بمشکل ۳۰ فیصد کے قریب آبادی کسی عیسائی فرقے سے وابستہ تھی۔ ان دونوں تبدیلیوں کو بیک وقت دیکھا جائے تو اب صورتحال یہ ہے کہ ملک کی ۳۱ فیصد آبادی کیتھولک اور ۳۰ فیصد کے قریب پروٹسٹنٹ ہے۔ اس طرح ایک تہائی آبادی کسی بھی مذہبی فرقے سے تعلق نہیں رکھتی۔

اس تناظر میں پہلا نمایاں رجحان لوگوں کی گرجا گھروں سے دوری نظر آتا ہے۔ اس کے ساتھ ایک دوسرا رجحان مذہبی تکثیریت کا بھی ہے۔ ایک جانب تو عیسائی مذہب کی سماجی وقعت میں مسلسل کمی واقع ہو رہی ہے لیکن دوسری جانب غیر عیسائی مذاہب بالخصوص اسلام کی اہمیت میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ اگرچہ قابل اعتماد اعداد و شمار میسر نہیں، تاہم ایک اندازے کے مطابق جرمنی میں چار فیصد مسلمان ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر تارکین وطن یا ان کی اولادیں ہیں۔ نئے مذہبی گروپوں کے وجود میں آنے کی وجہ سے قانونی نظام میں کچھ مسائل بھی جنم لے رہے ہیں، جن کا ہم تذکرہ کریں گے۔ قانون کو ایسے مذہبی عوامل سے واسطہ پیش آ رہا ہے، جو ۱۹۴۹ء میں Grundgesetz کی تشکیل کے وقت غیر متعلق اور غیر معروف تھے۔ تبدیل شدہ سماجی تناظر اور موجودہ مسائل سے نمٹنے کے لیے پرانے آئینی نظام کو بھی سوالات کا سامنا ہے۔ آئینی ضوابط کے دور از کار ہونے کا تاثر اس وقت مزید نمایاں ہو جاتا ہے جب یہ معلوم ہو کہ بعض متعلقہ آئینی ضوابط Grundgesetz سے بھی پہلے کے ہیں۔ Grundgesetz کے خالقوں نے ریاست اور مذہب سے متعلق بعض شقوں کو ۱۹۱۹ کے دستور ویمر (Weimar Constitution) سے کسی ردوبدل کے بغیر اپنا لیا تھا۔

نظریاتی وفکری منظر نامہ

ریاست اور مذہب کے تعلقات کے حوالے سے فیصلہ کن آئینی ڈھانچے پر نظر ڈالنے سے قبل ہمیں ان تعلقات کی تاریخ اور متعلقہ قانونی امور کا مختصر جائزہ لینا ہے۔ اس سے ہمیں قانونی ڈھانچے اور بجائے خود پورے منظرنامے کے نظری وفکری پس منظر کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔ تاریخی تناظر میں ریاست اور مذہب کے موجودہ تعلق کو مختلف فرقوں کے درمیان ایک صدی پر محیط تنازعات کی پیداوار کے طور پر دیکھنا ہوگا۔ مذہبی گروہوں کے درمیان کشمکش کو ختم کرنے کی پہلی بڑی کوشش ۱۵۵۵ء میں آگس برگ (Augsburg) کا امن سمجھوتا تھا۔ اس معاہدے نے کیتھولک کلیسا (Catholicism) اور لوتھری کلیسا (Lutheranism) کے لیے پُرامن بقائے باہمی کی پہلی قانونی بنیاد فراہم کی تھی۔ ''جس کی حکومت، اس کا دین'' کا اصول وضع کرکے مختلف ریاستوں کے امراء کو اپنے دائرہ اختیار میں مذہبی معاملات طے کرنے کی ضمانت دی گئی، یعنی خود اپنے اور اپنے زیردست افراد کے لیے فرقے کے تعین کی آزادی کا حق۔ تاہم مذہبی خانہ جنگی کو روکنے کے لیے حکمران اپنے شہریوں کو ریاست چھوڑ جانے کا حق دیتے تھے۔ ہم اس حق کو انفرادی مذہبی آزادی تسلیم کیے جانے کی جانب پہلا قدم تصور کرسکتے ہیں۔ باوجود اس کے کہ بعد کی صدیوں اور بالخصوص تیس سالہ جنگ میں ہونے والے مظالم سے اندازہ ہوتا ہے کہ مذہبی بنیاد پر ہونے والی خانہ جنگی کا وبال ختم نہ ہوا تھا، مذکورہ بالا حق کا تحفظ ایک خاص رجحان کی نشاندہی ضرور کرتا ہے۔ اس پورے منظرنامہ میں بنیادی نکتہ میدانِ سیاست میں مذہب کے داخلے پر پابندی لگا کر امن کا حصول ہے۔ ریاست نے مذہبی میدان سے پاؤں باہر نکالنے کا عمل شروع کیا اور اس کے ساتھ ساتھ مذہب کو بھی سیاست سے باہر آنا پڑا۔ سیاست اور مذہب میں تفریق کے اس عمل نے مذہب پر اہم اثرات مرتب کیے۔ مذہب رفتہ رفتہ نجی عمل بنتا چلا گیا اور عوامی امور میں اس کا دخل کم از کم ہوتا چلا گیا۔ چنانچہ یہ اس امر کا متقاضی ہوا کہ مذہب فرد کا نجی معاملہ ہو، جبکہ عوامی تقریبات میں عقیدے کا رسمی اظہار غیر سیاسی پہلوؤں تک محدود ہوتا چلا گیا''۔

آئینی منظر نامہ

ریاست اور مذہب کے درمیان موجودہ تعلقات دراصل جرمن قانون Grundgesetz کے تشکیل کردہ ہیں۔ ان قانونی اقدار کی افادیت دوطرفہ ہے۔ ایک طرف تو یہ فرد کے لیے مذہب کے کردار اور فرد کے ریاست سے تعلق کا تعین کرتا ہے۔ اس انفرادی حیثیت کو مذہب کے خلاف کسی بھی قسم کے امتیازی برتاؤ کی ممانعت کرکے مساوی سلوک کے حق سے مزید مستحکم کیا جاتا ہے۔ دوسری جانب آئینی ضوابط ریاست اور متنوع مذہبی گروہوں کے تعلق متعین کرتے ہیں۔

آئین کا بنیادی ضابطہ فرد کی مذہبی آزادی کا حق ہے، جس کو Grundgesetz کی دفعہ ۴ کے پہلے اور دوسرے پیراگراف میں بیان کیا گیا ہے۔ یہ دفعہ ریاست کو پابند کرتی ہے کہ وہ اپنے شہریوں کی مذہبی سرگرمیوں کا احترام کرے اور ان کے تحفظ کو یقینی بنائے۔ اس کے مفہوم میں جہاں مذہب کو اپنانے کی آزادی شامل ہے، وہیں عبادات کی آزادی بھی اس کا حصہ ہے۔ اس کے علاوہ کسی مذہب پر عمل پیرا فرد کو انفرادی زندگی اپنے عقائد کے مطابق گزارنے کا حق بھی حاصل ہے۔ ''یہ مذہبی آزادی منفی طور پر بھی حاصل ہے، یعنی کوئی بھی مذہب اختیار نہ کرنے کی آزادی۔ ایک انسانی حق کے طور پر یہ آزادی صرف جرمن شہریوں کے لیے ہی محدود نہیں، بلکہ جرمن ریاست میں مقیم تمام افراد کے لیے اور نہ صرف افراد بلکہ مذہبی گروہوں کے لیے بھی ہے۔ مذہبی عقیدے کی طرح یہی تحفظ

فلسفیانہ عقائد پر بھی لاگو ہوتا ہے۔ کیونکہ دونوں طرح کے عقیدوں کو مساوی سمجھا جاتا ہے۔

اس بنیادی حق کی اہمیت اُس قانونی شق سے مزید اجاگر ہوتی ہے جو مذہبی آزادی میں مداخلت اور اس پر قدغن کے امکان سے متعلق ہے۔ جہاں دیگر بنیادی حقوق، جیسے دفعہ ۸ کے تحت اجتماع کی آزادی، محدود یا کسی قانونی تقاضے سے مشروط ہے، دفعہ۴ کا متن اس نوعیت کے کسی بھی امکان سے خالی ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مذہبی سرگرمیاں کسی بھی ریاستی قدغن یا پابندی سے ماوراء ہیں، لیکن اگر ریاست مذہبی سرگرمیوں کو محدود کرنے کا فیصلہ کرے تو اسے مخصوص مقاصد کے تحت ہی ایسا کرنا ہوگا، ایسے مقاصد جو مذہبی آزادی کی طرح ہی دیگر اہم آئینی حقوق کے تحفظ سے متعلق ہوں، جیسے دیگر شہریوں کے بنیادی حقوق۔

کوئی خاص مذہبی یا فلسفیانہ عقیدہ اپنانے (یا نہ اپنانے) کی اس آزادی کو مزید استحکام قانون کی نظر میں برابری کے حق سے ملتا ہے۔ Grundgesetz کی دفعہ۳ کے پیراگراف ۳ کے مطابق کسی بھی فرد کو اس کے مذہبی عقائد کی بنیاد پر نفع یا نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔ دفعہ ۳۳ کے پیراگراف ۳ میں اس عمومی کلیہ کی وضاحت یوں کی گئی ہے کہ مذہبی وابستگی کی بنیاد پر کسی بھی فرد کو شہری یا سیاسی حقوق حاصل ہوں گے، نہ ہی عوامی عہدہ اور نہ کسی سرکاری عہدے پر فائز کیا جاسکے گا۔

مذہبی امور سے متعلق جرمن آئینی قانون کے دوسرے ستون کی جانب بڑھنے سے قبل ہمیں پہلے ایک خاص پہلو کی وضاحت کرنا ہوگی۔ ریاست اور مذہبی گروہوں میں تعلقات کے حوالے سے Grundgesetz ایک خاص گر استعمال کرتا ہے۔ اس قانون کی دفعہ ۱۴۰ سابق جمہوریہ ویمر (Weimar) کے آئین کا حوالہ دیتے ہوئے اس کی متعلقہ دفعات کو شامل کر لیتا ہے۔ جرمن آئینی عدالت کے مطابق اس طرح یہ امور پوری طرح موثر رہتے ہوئے آئین کا لازمی حصہ بن جاتے ہیں۔

دفعہ۴ کے انفرادی مزاج کے برعکس یہ ضوابط مذہب اور مذہبی گروہوں سے متعلق دستور کو ایک اداراتی شکل دیتے ہیں۔ یہ ریاست اور مذہبی گروہوں میں امتیاز کے ساتھ ساتھ تعاون کا حساس توازن قائم کرتے ہیں۔ بنیادی ضابطہ یہ ہے کہ ریاست کا کوئی مذہب نہیں ہوگا۔ جس سے مذہب اور ریاست کی علیحدگی کا تعین ہوجاتا ہے۔ ان دونوں شعبوں کے باہم عدم انحصار کی تصدیق کرتے ہوئے ویمر (Weimar) کی دفعہ ۱۳۷ کے تیسرے پیراگراف میں یہ قرار دیا گیا ہے کہ تمام مذہبی گروہ ان پر لاگو قانون کے دائرہ میں رہتے ہوئے اپنے امور آزادانہ طور پر چلائیں گے اور اس کا اطلاق سب پر ہوگا۔ خاص طور پر یہ کہ مذہبی ادارے ریاست یا سماجی حلقے کی شرکت کے بغیر اپنے اداروں کے عہدیدار خود مقرر کریں گے۔ تاہم چرچ اور ریاست کی اس علیحدگی کا مطلب فرانسیسی طرز کی مکمل لادینیت بھی نہیں ہے۔ بعد کے قوانین سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ علیحدگی ریاست اور مذہبی گروہوں کے درمیان بعض شعبوں میں تصادم کو ختم نہیں کرتی۔ تعاون کی صرف ان صورتوں کی ممانعت ہے جو مذہبی گروہوں کو ریاستی تنظیم کا حصہ بنانے کا باعث بنیں۔

ریاست اور مذہبی خودمختاری

ریاست اور چرچ کے درمیان ممکنہ تعاون کے ان شعبوں کا تفصیلی جائزہ لینے سے قبل ہمیں مذہبی امور سے متعلق جرمن قانون کے بنیادی نظریے پر غور کرنا ہوگا۔ انفرادی مذہبی آزادی اور ریاست اور چرچ کی علیحدگی کے دونوں پہلوؤں کو ساتھ ملایا جائے تو جرمنی میں ریاست اور مذہب کے تعلقات کا بنیادی اصول تشکیل پاتا ہے۔ اس اصول کو ریاست کی غیر جانبداری کے نظریے کے طور پر جانا جاتا ہے۔ اصولی طور پر ریاست کسی خاص مذہب یا فرقے کی نہ تو حمایت کرسکتی ہے اور نہ امتیازی سلوک۔ تمام مذہبی گروہوں سے عدم وابستگی ریاست کو عام طور پر مذہبی امور سے دور ہی رکھتی ہے۔ اگرچہ اس اصول کو لاحاصل لاتعلقی قرار دیتے ہوئے تنقید کا نشانہ بھی بنایا گیا، لیکن اس کے دفاع میں یہ بات زیادہ موثر تھی کہ مذہبی امور کو قانون کے دائرے میں رکھنے کے لیے ایسا طرز عمل ضروری ہے۔

ریاست کی یہ غیر جانبداری مذہب کے قانونی پہلو کے لیے قابل ذکر اثرات کی حامل ہے۔ ریاست اس بات کا تعین نہیں کرسکتی کہ کس چیز کو مذہب یا مذہبی رویہ قرار دیا جائے۔ ایسی کوئی فہرست موجود نہیں ہے جو تسلیم کردہ مذہبی طبقات کا تعین کرتی ہو۔ بلکہ اس کے برعکس مذہبی آزادی کے تحت کسی بھی مکمل نئے مذہب کی تشکیل کی اجازت موجود ہے۔ تاہم اگر ریاست یہ وضاحت نہیں کرسکتی کہ مذہب کیا ہے، تو کون کرسکتا ہے؟ اس حوالے سے جرمنی کے دستور کا جواب یہ ہے: اس کے ذمہ دار خود مذہبی گروہ ہیں۔ مذہب کا قانونی تصور مذہبی گروہوں کے خود تشریح کردہ تصور پر مبنی ہے۔ تاہم مذہبی آزادی کے غلط استعمال کو روکنے کے لیے کچھ احتیاطی تدابیر تو بہرحال لازم ہیں۔ کسی طرزِ عمل کو مذہب سے وابستہ قرار دے کر اس کے لیے قانونی تحفظ حاصل کرنے کا فیصلہ صرف مذہبی گروہوں پر نہیں چھوڑا جانا چاہیے۔ اس حوالے سے کچھ ریاستی عمل دخل بھی درکار ہے۔ تاہم ریاستی کردار اسی صورت میں نظر آتا ہے جب کوئی گروہ مذہبی آزادی کا غلط استعمال کرتا ہے، جیسے اسے معاشی فوائد سمیٹنے کے لیے استعمال کرنا۔ یہ معاملہ ایک مسلسل بحث کا موضوع ہے۔

مذہب کی تشریح کا یہ عمل دراصل ابھی پروان چڑھ رہا ہے۔ درحقیقت جرمنی کی وفاقی عدالت کے کچھ فیصلوں میں مذہب کی تشریح کی زیادہ ٹھوس کوششیں کی گئی ہیں۔ عدالت نے ثقافتی موزونیت کی شق متعارف کروانے کی کوشش کی جس میں مذہب کو ایسے مظاہرے سے تعبیر کیا گیا ہے جنہیں تہذیب یافتہ افراد نے دیگر ثقافتی اقدار کی طرح مشترکہ اخلاقی اقدار کی بنیاد پر تشکیل دیا ہے۔ چونکہ اس قسم کی تشریحات ریاست کی غیر جانبداری سے متعلق آئینی پابندی سے مطابقت نہیں رکھتی تھیں۔ چنانچہ بعد کے فیصلوں میں ان کو ترک کردیا گیا۔ اس کے نتیجہ میں مذہب یا مذہبی گروہ کے تعین کے حوالے سے غیر واضح تشریحات ہیں۔ مذہب کے بارے میں عمومی تشریح یہ ہے کہ یہ انسانیت سے متعلق کچھ سچائیوں اور ان کی تفصیل پر یقین کا نام ہے۔

ریاست کی غیر جانبداری کے اس تصور کو سامنے رکھا جائے تو مذہب کے ساتھ اس کے تعاون کی اہم ترین صورت حیرت انگیز محسوس ہوگی، سماجی مذہبی تنظیموں کو ماضی میں حاصل مراعات کے مطابق بدستور کارپوریشنوں کی حیثیت حاصل ہے۔ دیگر سماجی مذہبی تنظیموں کو بھی درخواست دینے پر اسی قسم کی مراعات حاصل ہوں گی مگر شرط یہ ہے کہ ان کا دستور اور ارکان کی تعداد ان کے مستقل قائم رہنے کی ضمانت دیں۔

شاید یہ خاص حیثیت اس عمومی تصور سے متصادم ہے کہ ریاست کا کوئی مذہب نہیں ہوگا۔ بظاہر اس قانونی اختیار کے تفویض کیے جانے کے بعد مذہبی گروہ بھی ریاستی انتظام میں شریک ہوسکتے ہیں اور ریاست کا ناگزیر حصہ بن سکتے ہیں۔ تاہم یہ دراصل دستور ویمر (Weimar) کی تیاری کے دوران مباحثوں میں ہونے والے سمجھوتے کا نتیجہ ہے۔ اس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ روایتی گرجا گھروں کو نجی تنظیمات کا درجہ دیا جائے۔ اس وقت گرجا گھروں کے غیر معمولی سماجی کردار اور ذمہ داریوں کے مقابلے میں اس حیثیت کو ناکافی اور ہتک آمیز تصور کیا گیا تھا۔ قانون کے مطابق کارپوریشنوں کی حیثیت کے باوجود متعلقہ مذہبی گروہ ریاست سے بدستور الگ رہیں گے۔ وہ ریاست کا حصہ نہیں بنیں گے۔ تاہم جرمن عدالت کے مطابق اس حیثیت سے کلیسا کی آزادی متاثر نہیں بلکہ مستحکم ہوتی ہے۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ یہ حیثیت ریاست سے وفاداری کا بدل ہے۔

مذہبی گروہ اپنے ارکان کو ہدایت کرتے ہیں کہ وہ ریاستی انتخابات میں حصہ نہ لیں۔ جرمنی کی وفاقی انتظامی عدالت نے اس ہدایت کو ریاست سے وفاداری کے ایک انداز کے طور پر دیکھا۔ تاہم اعلیٰ جرمن عدالت نے اس حوالے سے یہ وضاحت کی کہ اگر کوئی مذہبی گروہ ریاست کے لادین ہونے پر اعتراض کرے تو یہ آئین کی خلاف ورزی نہیں، جب تک کہ وہ مذہبی گروہ کسی مذہبی حکومت کے قیام کے لیے موجودہ قانونی نظام کا تختہ الٹنے کی کوشش نہ کرے، یا دوسرے الفاظ میں جب تک وہ شہریوں کے بنیادی حقوق اور مذہبی رواداری کے اصول کا احترام کرتا ہے۔

اس کے علاوہ بھی ریاست اور مختلف مذہبی گروہوں میں تعاون کا سلسلہ کئی صورتوں میں جاری رہتا ہے۔ ان میں سرکاری اسکولوں میں مذہبی تعلیم، فوجی اداروں میں مذہبی عقائد اور مذہبی اور روحانی رہنمائی کے شعبوں کا قیام شامل ہیں۔ ریاست اور مذہبی گروہوں میں تعاون کی ان ممکنہ اقسام سے جرمنی میں ریاست اور مذہب کے تعلقات کے لیے آئینی انتظام کی خصوصیت سامنے آتی ہے۔ آئین ریاست اور مذہبی گروہوں کا مخالف نہیں اور نہ ہی یہ ان دونوں میں زیادہ دوری کا حامی ہے۔ اس کے برعکس یہ ریاستی حکام کو ہدایت کرتا ہے کہ وہ مختلف مذہبی گروہوں کی معاونت کرے۔ جرمن عدالت کے مطابق ریاست کی غیر جانبداری کو ایک کھلے اور جامع طرز عمل کے طور پر سمجھنا چاہیے، جو مساوی انداز میں تمام مذاہب کے پیروکاروں کی مذہبی آزادی کا حامی ہے۔

مذہب اور ریاستی خودمختاری

جیسا کہ ہم نے مشاہدہ کیا ریاست کی غیر جانبداری تعاون کی بعض اقسام تک محدود ہے، جن کی بدولت مذہبی معاشرے ریاستی ڈھانچے کا حصہ بن جاتے ہیں۔ دوسری جانب مذہبی گروہوں کو یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ وہ ریاست کے امور میں مداخلت نہیں کریں گے۔ مذہب کی خودمختاری اس وقت ختم ہو جاتی ہے، جہاں متنوع سماجی امور داؤ پر لگے ہوں۔ مثال کے طور پر اس صورت میں یہ ناقابل قبول ہوسکتی ہے جب کوئی مذہبی طبقہ ایسے مذہبی قانونی نظام کے قیام کی کوشش کرے جس سے ریاست کی خودمختاری متاثر ہوتی ہو۔ قانون کے مطابق مذہبی گروہ اس قانون کے تابع ہوں گے جس کا اطلاق سب پر ہوتا ہو۔ یہ ایک ایسے اندرونی عدالتی نظام کے قیام کو خارج از امکان قرار نہیں دیتی جو مذہبی برادری کے اندر مخصوص امور کے بارے میں فیصلے کرے۔ لیکن جہاں تک خارجی پہلوؤں کا تعلق ہے ریاستی عدالتوں ہی میں ان کی سماعت ہوگی۔

قانونی منظرنامہ

تفصیلی آئینی منظرنامے کے بعد ریاست اور مذہب کے درمیان تعلقات کے حوالے سے قوانین کی وضاحت کی زیادہ ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ تاہم جرمنی کی وفاقی اراضی سے متعلق قانون اہم ہے جس کا اندازہ ایک ایسے تنازع کے بعد ہوا جو دیگر ممالک میں بھی مانوس ہے، یعنی ایک معلّمہ کے سر ڈھانپنے کا مقدمہ۔ ایک جرمن عدالت نے فیصلہ دیا کہ جب کوئی معلّمہ تدریس کے دوران اپنے سر سے کپڑا اُتارنے کو تیار نہ ہو تو حکومت اسے ملازمت دیے رکھنے کی عموماً پابند نہیں۔ تاہم مذہبی آزادی پر کسی بھی قسم کی قدغن کا کوئی خاص مقصد ہوتا ہے جو کہ بذاتِ خود آئینی حق ہے۔ مزید یہ کہ یہ پابندیاں صرف قانون کے ذریعے یا اس کے مطابق ہی عائد کی جاسکتی ہیں۔

چونکہ متعلقہ جرمن علاقہ میں اس حوالے سے کوئی قانون سازی نہیں تھی، اس لیے اعلیٰ عدالت نے معلّمہ کو ملازمت نہ دینے کے عمل کو غیر منصفانہ اور متعلقہ خاتون کی مذہبی آزادی کے منافی قرار دیا۔ اس فیصلے کے نتیجے میں جرمن حکومت نے ایسے متعدد قانون بنائے، جن میں اساتذہ پر کمرۂ جماعت میں کسی بھی قسم کی مذہبی علامت کو پہننے سے منع کیا گیا تھا۔ اعلیٰ عدالتوں نے ان قوانین کو تسلیم کرلیا کیونکہ یہ تمام مذاہب کے لیے یکساں تھے اور اس طرح ان میں ریاست کی غیر جانبداری کا اصول کارفرما تھا۔ جرمنی کے قوانین کے علاوہ یورپی یونین کے قوانین بھی اہم ہیں۔ مقامی اور یورپی قوانین مل کر معاشرے کا بنیادی نظام قائم کرتے ہیں۔

مذہبی امور سے متعلق قانونی ڈھانچے کا حال بھی یہی ہے۔ اگرچہ متعلقہ معاہدات ان امور پر یونین کو کوئی بالادست حیثیت نہیں دیتے لیکن یورپی یونین کے قوانین ریاست اور مذہب کے تعلق اور مذہبی گروہوں کی قانونی حیثیت سے متعلق اہمیت ضرور رکھتے ہیں۔ بعض دفعات نسل، زبان یا مذہب کی بنیاد پر کسی بھی قسم کے امتیاز پر خاص طور پر پابندی سے متعلق ہیں۔ مزید برآں یورپی یونین مذہبی آزادی کا احترام اور تحفظ کرتی ہے۔ یورپی یونین کے معاہدے کی دفعہ ۶ کا دوسرا پیراگراف یونین کو پابند کرتا ہے کہ وہ انسانی حقوق کے یورپی کنونشن کے مطابق بنیادی حقوق اور رکن ملکوں کی مشترکہ قانونی روایات کا تحفظ کرے۔ اس طرح انفرادی مذہبی آزادی کے ساتھ ساتھ قومی آئینی بنیادی حقوق بھی یورپی یونین کے قانون کا حصہ ہیں۔

سماجی مظاہر کے طور پر مذہب کا قانونی ضابطہ

مذہب کی آزادی کی آئینی ضمانت کے بعض سماجی عوامل سے متعلق قانون سازی پر اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اس آزادی کی رُو سے ریاست سے یہ توقع رکھی جاتی ہے کہ وہ استثنائی شقوں کا اضافہ کرکے مذہبی امور میں سہولت فراہم کرے۔ مقنّنہ اور انتظامیہ کو درپیش صورتحال کی مثال یوں دی جاسکتی ہے کہ ایک جانب تو جانوروں کو ذبح کیا جاتا ہے اور دوسری جانب حیوانوں کے تحفظ پر کام ہورہا ہے۔ حیوانوں کے تحفظ کے جرمن قانون کی دفعہ ۴ کے مطابق کسی بھی جانور کو بے ہوش کیے بغیر ہلاک نہیں کیا جاسکتا۔ اسی قانون کا اطلاق جانوروں کے ذبح کرنے پر بھی ہوتا ہے۔ مگر بعض مذہبی ضوابط کے مطابق جانوروں کو بے ہوش کیے بغیر ہی ذبح کیا جاتا ہے اور اس حوالے سے مذہبی تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے قانون میں استثنیٰ ہے۔ اگر ان تقاضوں کو متعلقہ مذہبی کمیونٹی جامع انداز میں بیان کردے تو حیوانوں کے تحفظ کے تصور کو ہی ختم کرنا ہوگا۔

مذہب کے لیے ریاست کی مالی معاونت

جرمنی میں مذہبی گروہوں کے لیے آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ ٹیکس محاصل ہیں۔ ایسی مذہبی سماجی تنظیمیں ٹیکس عائد کرسکتی ہیں جو پبلک لاء کے تحت کارپوریشن کے طور پر کام کررہی ہوں۔ مزید یہ کہ متعلقہ مذہبی گروہ ان ٹیکسوں کو جمع کرنے کے لیے ریاست اور اس کے ٹیکس جمع کرنے کے نظام کو استعمال کرسکتے ہیں۔ اس کے برخلاف وہ مذہبی طبقات جو نجی تنظیموں کی قانونی صورت میں ہیں وہ اپنے ارکان کے عطیات اور مالی تعاون پر ہی بھروسہ کرتی ہیں۔ علاوہ ازیں حکومت کی طرف سے مذہبی طبقات کو کئی طرح کی مالی رعایتیں حاصل ہوتی ہیں۔ مالی رعایت دینے والے یہ ادارے انیسویں صدی میں لادینیت کے عمل کے دوران گرجا گھروں کو مالی معاونت دینے کے لیے قائم کیے گئے تھے اور وفاقی حکومت کی قانون سازی ہی سے تحلیل ہوسکتے ہیں۔

شہری قوانین پر مذہبی اثرات

عمومی طور پر لادین قانون کسی مذہبی قانون کے تحت کیے گئے افعال کے قانونی اثرات کو تسلیم نہیں کرتا۔ مذہبی عوامل کے شہری قوانین پر اثرات کا ایک دلچسپ پہلو شادی کی تقریب کا ایک جانب ریاست کے انتظام میں اور دوسری جانب چرچ میں کرنے سے متعلق دیوانی قانون میں حالیہ تبدیلی ہے۔ سال ۲۰۰۸ء میں قانون ساز ادارے نے اس قانون میں تبدیلی کی اور اب شہریوں کو ماضی کی طرح چرچ میں شادی کرنے کی سہولت حاصل ہوگئی ہے۔ اگرچہ اس ترمیم سے

چرچ کی شادیوں کے قانونی اثرات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔

یہی معاملہ محنت سے متعلق قوانین کے حوالے سے بھی دکھائی دیتا ہے۔ ریاستی عدالتیں تسلیم کرتی ہیں کہ چرچ کی ملکیت میں چلنے والے اداروں میں کام کرنے والے افراد سے خود اسی طبقہ کے بنیادی عقائد کی پاسداری کی توقع کی جاسکتی ہے۔ مزید مخصوص قانونی اثرات پبلک لاء کے تحت کارپوریشنوں کی حیثیت سے منسلک ہیں۔ ٹیکس عائد کرنے کے علاوہ اپنی حیثیت کی بدولت وہ دیگر امور بھی انجام دے سکتے ہیں۔

نوجوانوں کی مذہبی تعلیم

وفاقی نظام ہونے کی بدولت جرمنی میں اسکولوں کی تعلیم بنیادی طور پر وفاقی سطح کا معاملہ ہے۔ تاہم Grundgesetz کی دفعہ ۷ کے تیسرے پیراگراف میں مذہبی تعلیم کے معاملے کی پوری طرح وضاحت کی گئی ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ مذہبی تعلیم کو اسکول کے ایک مضمون کی حیثیت حاصل ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ مذہبی تعلیم مستقل نصاب کا حصہ ہوگی۔ یہ صرف ایک اختیاری امکان نہیں ہے۔ اگرچہ ریاست اپنے نگرانی کے حق کو قائم رکھنا چاہتی ہے مگر تعلیمی پروگرام کا تعین مختلف سماجی طبقات کرتے ہیں۔ مذہبی طبقہ کی تعلیمات کے مطابق مذہبی ہدایت دی جاتی ہے۔ اس طرح مذہبی تعلیم نہ صرف مختلف مذاہب کے عقائد کی غیر جانبدارانہ وضاحت سے تشکیل پاتی ہے، یہ اپنے اپنے عقائد کی تعلیم خود دیتی ہے۔ ایک جانب تو مذہبی تعلیم کی مخصوص صورت کی وجہ سے اور دوسری جانب ضمانت شدہ مذہبی آزادی (خاص طور پر اپنے منفی پہلو کے ساتھ) کی بنا پر کسی بھی طالب علم کو اس قسم کی مذہبی تعلیم کے لیے مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ مذہبی کلاسوں میں شریک نہ ہونے والوں کے لیے اخلاقی کورسز کی صورت میں متبادل تعلیمی پروگرام موجود ہے۔ حالیہ زمانے میں مذہبی تعلیم سے متعلق تنازعات کے دو بڑے شعبے سامنے آئے۔

ایک کا تعلق اخلاقی کورسز کے موضوع سے ہے۔ وفاقی حکومت کے قانون سازوں نے ایسے قانون تیار کیے ہیں جن کی بدولت اخلاقی کورسز میں تمام طلبہ کی شرکت لازمی ہے۔ جس کی وجہ سے مذہبی تعلیم اختیاری مضمون بن کر رہ گئی ہے۔ Grundgesetz کی بظاہر خلاف ورزی سے بچنے کے لیے انہوں نے اسی قانون کی ایک دوسری دفعہ کا سہارا لیا ہے، جس کی تشریح یہ ہے کہ قانون کا متعلقہ حصہ مغربی برلن سے متعلق تھا۔ دونوں ملکوں کے دوبارہ ایک ہونے کے بعد یہ سوال پیدا ہوا کہ سابق عوامی جمہوریہ جرمنی کے خطے پر اس شق کا اطلاق کیا جائے یا نہیں۔ ایسے میں یہ دعویٰ سامنے آیا کہ اس شق سے انحراف ممکن ہے۔

دوسرا موضوع نئے مذہبی گروپوں کے وجود میں آنے کے بعد پیدا ہونے والے مخصوص مسائل سے متعلق ہے۔ ایک خاص مسئلہ یہ ہے کہ آیا اسلام کی تعلیم دی جاسکتی ہے۔ جب کہ اس کے موضوعات اسلامی تعلیمات ہی کے مطابق تیار کیے جاسکیں گے۔ تاہم اسلام کی بنیادی تعلیمات میں سے شاید ہی کچھ امور ایسے ہوں جو تمام مسلمانوں کے لیے یکساں طور پر مربوط ہوں۔ ایسے میں ریاست کو مختلف فرقوں سے مختلف تعلیمات کے حوالے سے خاصی مشکل پیش آتی ہے، کیونکہ ان میں بہت تنازعات ہیں۔ اس طرح سوال یہ ہے کہ آیا Grundgesetz کی دفعہ ۷ کے تیسرے پیراگراف کی رُو سے کیا یہ ممکن ہے کہ مذہبی تعلیم دینے کے بجائے ریاست ایک ایسا تعلیمی پروگرام پیش کرے جس میں زیادہ معروضی اور سائنسی انداز میں اسلام کی تعلیم دی جائے۔ نجی اسکولوں کے حوالے سے یہ سوال زیادہ نمایاں طور پر سامنے آیا ہے۔ جرمن قانون میں نجی اسکولوں کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنے تعلیمی مقاصد، سہولتوں یا اپنے تدریسی عملے کی پیشہ وارانہ تربیت کے حوالے سے سرکاری اسکولوں سے کسی طور کمتر نہ ہوں۔ سرکاری حکام ایسے نجی اسکولوں کے قیام کی منظوری نہیں دیتے، جہاں طلبہ میں ان کے والدین کی مالی حیثیت کے اعتبار سے تفریق کی جائے۔ اس حوالے سے یہ سوال بھی پیدا ہوسکتا ہے کہ آیا طلبہ میں ان کے فرقے کے اعتبار سے تفریق حکومت کی منظوری نہ ملنے کی ایک اور وجہ بن جائے۔

عوامی مقامات پر مذہبی علامات

حالیہ برسوں کے مشہور مقدمات میں اسکول کے کمرہ ہائے جماعت میں صلیب کے نشان کا سوال بھی تھا۔ بویریا (Bavaria) میں ہر کلاس روم کی دیوار پر صلیب کا نشان لگانا لازمی تھا۔ چنانچہ اعلیٰ جرمن عدالت نے فیصلہ کیا کہ یہ عمل دستور سے متصادم ہے۔ ججوں کے مطابق طلبہ کو صلیب کے سائے میں تعلیم دینا ناقابل قبول ہے۔ کیونکہ صلیب نہ صرف ثقافتی بلکہ حقیقی مذہبی اور حتیٰ کہ ایک مشنری علامت ہے۔ اسی طرح ایک فیصلے میں کمرۂ عدالت میں چھوٹی صلیب کے نشان لگانے کو بھی آئین سے متصادم قرار دے کر روک دیا گیا۔ دونوں مقدمات میں عدالت عالیہ نے صلیب لٹکانے کو ریاست کی جانب سے ایک خاص مذہب کی علامت کا مظاہرہ کرنے کا عمل قرار دیا۔ اسی لیے اسے غیر جانبداری کے اصول کی خلاف ورزی بھی قرار دیا گیا۔

اظہار رائے کی آزادی اور مذہب کے خلاف جرائم

جرمنی کے فوجداری قوانین ۶۳ میں مذہب اور نظریے سے متعلق جرائم پر پورا ایک باب ہے۔ اس قانون کی ایک انتہائی اہم شق STGB۱۶۶ ہے، جس میں مذہب اور مذہبی و نظریاتی وابستگی کو نشانہ بنانے کو ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ اس کے بعد کی شق ۱۶۷ میں مذہب پر عمل کرنے، خاص طور پر مذہبی عبادات میں خلل ڈالنے کو ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ تاہم ان شقوں کا بنیادی مقصد فرد کے مذہبی عقائد یا مذہبی طبقات کا تحفظ نہیں ہے۔ اس قانون کا مقصد تمام شہریوں کی پُرامن بقائے باہمی یا امن عامہ کو یقینی بنانا ہے۔ اس خصوصی مقصد کی وجہ سے حال ہی میں عدالتوں نے مذہب کو بدنام کرنے کے بیانات کا تعین کرنے میں پس وپیش سے کام لیا۔ ہالینڈ میں حضور اکرم ﷺ کے توہین آمیز سوانحی خاکوں کی اشاعت کے بعد جب اس معاملے پر مسلمانوں کے احتجاج نے شدت اختیار کی تو بعض جرمن سیاست دانوں نے تجویز کیا کہ مذہبی احترام کے تحفظ کے لیے سخت اقدامات کرنا چاہئیں۔ تاہم یہ کوششیں اب تک کامیاب نہیں ہوسکیں۔

حاصل کلام

بنیادی سوال یہ ہے کہ کیا ساٹھ سال سے زائد عرصہ بعد بھی جرمن دستور عصر حاضر کے چیلنجوں سے نمٹ سکتا ہے۔ یہ مسئلہ اس وقت زیادہ وضاحت کے ساتھ سامنے آیا جب یہ بات موضوع بحث بننے لگی کہ آیا ریاست اور مذہب کے تعلقات کے حوالے سے روایتی جرمن قانون کو ایک نئے تصور سے تبدیل کرنے کی ضرورت ہے یا نہیں۔ ہماری گزشتہ وضاحتوں کی روشنی میں یہ امر واضح ہو جانا چاہیے کہ ریاست کا کوئی چرچ نہیں ہوتا، اس لیے اس سے متعلق کوئی قانون بھی نہیں ہوسکتا۔ اس امر کو ''چرچ کے آئینی قانون'' کے زیادہ وسیع مفہوم میں سمجھا جاسکتا ہے۔ اگرچہ اس کے بعد بھی چرچ کا حوالہ بدستور رہے گا، جسے مختلف مذاہب اور عقائد پر مبنی ہمارے موجودہ معاشرے میں ناکافی سمجھا جاسکتا ہے۔ اگر اسے ''مذہب کے آئینی قانون'' سے تعبیر کیا جائے تو یہ زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اسے روایتی اداروں کے بجائے انفرادی مذہبی آزادی کو زیادہ اہمیت دینے کے لیے تیار کیا گیا ہے۔ حالیہ سماجی تبدیلیوں کے پس منظر میں یہ تصور زیادہ بہتر معلوم ہوتا ہے، تاہم ہمیں محتاط رہنا چاہیے۔

باقی صفحہ نمبر ۱۱

ٹرمپ آمریت پر فریفتہ

Stephen M. Walt

چند عشرے کتنا فرق ڈال دیتے ہیں۔ ۹۰ کی دہائی کے وسط میں امریکیوں (اور بعض دیگر اقوام) کو یقین تھا کہ امریکی لبرل جمہوریت مستقبل میں دنیا پر چھا جائے گی۔ وارسا پیکٹ پاش پاش ہو چکا تھا۔ لاطینی امریکا کے آمر انتخابات کرا رہے تھے۔ انسانی حقوق کے تصورات پھیل رہے تھے اور لبرل ادارے پروان چڑھ رہے تھے۔ انسانیت کا مستقبل جمہوریت سے وابستہ دکھائی دیتا تھا۔ فرانسس فوکویاما کے مشہور جملے ''انسانیت اپنا نقطۂ عروج پا چکی'' اور ''یہاں تاریخ اختتام پذیر ہوتی ہے'' دنیا بھر میں عمومی سیاسی سوچ کا حصہ بن چکے تھے۔ ٹامس فریڈ مین ہم سب کو بتا رہے تھے کہ سبھی سرمایہ دارانہ نظام کو اپنا چکے ہیں۔ اور یہ کہ اس نظام کا اہم ترین کھلاڑی امریکا ہے۔

یہ بات قابل فہم ہے کہ اگلے تین امریکی صدور نے انہی تصورات کو سراہا، اپنایا اور آگے بڑھایا۔ بل کلنٹن کی قومی سلامتی پالیسی ''روابط رکھنے اور اپنا حلقہ اثر وسیع کرنے'' کے گرد گھومتی تھی۔ اس کا علانیہ مقصد جہاں تک ہو سکے، جمہوریت کا پھیلاؤ تھا۔ جارج ڈبلیو بش 'لبرٹی ڈاکٹرائن' رکھتے ہوئے طاقت کا ایسا توازن چاہتے تھے جو آزادی کی حمایت کرے۔ انہوں نے اپنے دوسرے افتتاحی خطاب میں اسے امریکا کا ''مقدس مشن'' قرار دیا۔ براک اوباما نے اس ہدف کا محتاط جائزہ لیا، تاہم تمام تر احتیاط کے باوجود انہوں نے لیبیا اور شام میں آمریتوں کے خلاف کارروائی کی۔ انہوں نے ۲۰۱۰ء میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کو بتایا کہ اپنے رہنما چننے اور اپنے مقدر کا تعین کرنے سے زیادہ بنیادی حق کوئی اور نہیں۔ اس طرح گزشتہ بیس برسوں سے امریکا کو یقین تھا کہ دنیا مزید لبرل، قابل احتساب اور جمہوری گورننس کی طرف بڑھ رہی ہے۔ اور اس پر کسی کو بھی کوئی شک نہیں ہونا چاہیے۔

لیکن پھر کیلنڈر پر ۲۰۱۷ء کا صفحہ پلٹا۔ اور امریکیوں کو یکا یک احساس ہوا کہ فرد واحد کی حکومت کا دور واپس آ چکا ہے۔ روس میں آمریت کا راج ہے۔ چینی رہنما شی جن پنگ بھی اپنی طاقت مستحکم کر چکے ہیں۔ بعض حلقے اُنہیں چیئرمین ماؤزے تنگ سے بھی زیادہ بااثر قرار دیتے ہیں۔ ایک اہم عرب ملک کے ولی عہد احتساب کی آڑ میں اپنے سیاسی مخالفین کا صفایا کرنے پر کمربستہ ہیں۔ وہ ملک کی زیادہ تر طاقت اپنے ہاتھوں میں لے چکے ہیں۔ مصر پر ایک مرتبہ پھر انتہائی سفاک اور بدعنوان فوجی آمریت مسلط ہے۔ ترک صدر طیب اردوان نے ناکام فوجی مداخلت کے بعد ہزاروں صحافیوں، دانشوروں، اساتذہ، سرکاری اور دفاعی اداروں کے اہلکاروں اور سیاسی کارکنوں کو جیلوں میں بند کر رکھا ہے۔ ناقدین کا کہنا ہے کہ وہ بتدریج عثمانی خلافت کی طرف پیش قدمی کر رہے ہیں۔

اس وقت مشرق وسطیٰ میں داعش کی آندھی بیٹھ چکی ہے لیکن کوئی نہیں جانتا کہ عراق اور شام میں کس قسم کی حکومتیں قائم ہوں گی۔ ایک بات البتہ یقینی طور پر کہی جا سکتی ہے اور یہ کہ یہ حکومتیں جمہوری ہرگز نہیں ہوں گی۔ مشرقی یورپ بھی مکمل طور پر جمہوری نہیں۔ ہنگری اور پولینڈ یقینی طور پر آمریت کی راہ پر گامزن ہیں۔ یہ ریاستیں کھل کر لبرل تصورات کی نفی کر رہی ہیں۔ ایسا کرنے سے ممکن ہے کہ وہ یورپی یونین کی رکنیت کے لیے نااہل ہو جائیں لیکن شاید ان کے پیش نظر کچھ اور مقاصد ہیں۔

اس عالمی ماحول میں امریکی حکومت کیا کہہ سکتی ہے؟ ڈونلڈ ٹرمپ کی حکومت کے پاس ان آمریتوں اور فرد واحد کی حکومتوں کے لیے ستائشی الفاظ کی کمی نہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ امریکا کو نسلی بنیاد پر تقسیم کرنے والے اس ''عظیم رہنما'' (Divider-in-Chief) کو آمریتوں سے کوئی شکوہ یا شکایت نہیں، بلکہ ہو سکتا ہے کہ وہ اُنہیں قدرے رشک بھری نظروں سے بھی دیکھتے ہوں کہ اُن ریاستوں میں حکمرانوں کا نہ کوئی احتساب ہوتا ہے اور نہ ہی کسی آئینی قدغن کا پہرا۔ اس میں کسی کو حیرت نہیں ہونی چاہیے کہ یہ صدر (ٹرمپ) نظام انصاف کو ہدفِ استہزا بناتے رہتے ہیں۔ انہیں اس بات کا دکھ ہے کہ نظامِ انصاف پر ان کا زیادہ کنٹرول کیوں نہیں۔ انہوں نے ایف بی آئی کے جیمز کومی کو محض اس لیے نکال باہر کیا کہ وہ صدر پر اپنی وفاداری ثابت کرنے میں ناکام رہے تھے۔ صدر نے اُنہیں امریکی صدارتی انتخاب میں روس کی تکنیکی مداخلت کی تحقیقات روکنے کا حکم دیا تھا۔

ٹرمپ یہ تاثر دے رہے ہیں کہ ان کے ہوتے ہوئے ریاستی اداروں کی ضرورت نہیں۔ وہ جو چاہتے ہیں کر سکتے ہیں۔ ان پر کوئی پابندی درست نہیں۔ لیکن ٹرمپ سے معذرت کے ساتھ، امریکی حکومت نے طویل عرصے تک جمہوریت کا دفاع کیا ہے۔ اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ اس نے طویل مدت تک جمہوریت کے لیے قربانیاں دی ہیں۔ اور یہ مزید قربانیاں بھی دے سکتی ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ڈونلڈ ٹرمپ کا رویہ امریکا کی سیاسی روایات سے کھلا انحراف ہے۔ امریکا نے جمہوریت کی حمایت کرنے میں اکثر عدم تسلسل سے کام لیا ہے اور اہم ایشوز پر آمروں کے ساتھ خوش دلی سے اتحاد کیا ہے، لیکن اہم سیاسی معاملات اور دوسرے مفادات پر ڈیل کرنا ایک بات ہے اور اپنے نظریات کو چھوڑ کر غیر نمائندہ شخصیات کی تعریفوں کے پُل باندھنا الگ چیز ہے۔ ایسا کرنا بھی برا ہے کیونکہ یہ اس روایت کو، جو ماضی میں ایک قیمتی سفارتی اثاثہ ہوا کرتی تھی، توڑ دیتا ہے۔ یہ اس بات کا یقین تھا کہ امریکا محض انفرادی نوعیت کے مفادات کی بجائے کسی اور مقصد کے لیے اسٹینڈ لیا کرتا ہے۔

یہ تبدیلی وہ نہیں ہے جس کا لوگوں کو سرد جنگ کے فوراً بعد انتظار تھا، لیکن یہ حیران کن بھی نہیں۔ طاقتور ہونے کے بجائے دنیا کی بڑی اور اہم جمہوریتوں کو گزشتہ پچیس سال کے دوران بڑے نقصانات سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ امریکا نے عراق پر غلط وجوہ کی بنیاد پر حملہ کیا۔ معاملات کو الجھایا اور انتظامی صورت حال کی خرابی کے باعث بڑے پیمانے پر نقصان بھی اٹھایا۔ اس کے نتیجے میں امریکا کا سیاسی نظام بگڑتا چلا گیا۔ سیاست دانوں کے بارے میں عوام کی رائے دن بہ دن خراب سے خراب تر ہوتی چلی گئی۔ اس سے بھی بدتر یہ کہ کسی ذمہ دار سے جواب طلبی نہ کی گئی اور عوام کے عروج پاتے غم و غصے کو ٹرمپ کے اقدامات نے مزید جلا بخشی۔ یورپ میں یورو کا قیام ایک مہلک غلطی ثابت ہوا، جس کے نتائج بہت دور تک جاتے ہیں۔ برطانیہ کے یورپی یونین سے الگ ہونے کے فیصلے نے برطانوی حکمرانوں کی نااہلی کا پردہ چاک کیا۔

ڈونلڈ ٹرمپ جنہیں قابل رشک سمجھتے ہیں ایسے بہت سے آمر ز را بھی شاندار ریکارڈ نہیں رکھتے۔ اردوان کا کنٹرول سخت ہونے سے ترک معیشت کے مسائل میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ پیوٹن نے چند ایک معاملات میں بہتر کارکردگی کا مظاہرہ ضرور کیا ہے تاہم وہ روسی معیشت کی کمزوریاں دور کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ وہ معاشرتی مسائل کا بہتر حل تلاش کرنے میں بھی ناکام رہے ہیں۔ حد یہ ہے کہ چین کو بھی متاثر کن کارکردگی کے باوجود بہت سے مسائل کا سامنا ہے۔ ون بیلٹ ون روڈ منصوبہ بھی کچھ زیادہ خوش کن دکھائی نہیں دیتا۔

امریکا اور کچھ دوسری جمہوریتوں نے دو دہائیوں سے بری کارکردگی دکھانے کے باوجود خود کو کامیابی سے قائم رکھا ہے۔ یہ یاد رکھنے والی بات ہے کہ ۲۰۰۸ء کے بحران سے امریکا نے خود کو تیزی سے باہر نکالا تھا۔ یہ ایک ایسی کامیابی تھی جس کا براک اوباما کو پورا کریڈٹ کبھی نہیں دیا گیا۔ (ترجمہ: محمد ابراہیم خان)

"Trump isn't sure if Democracy is better than Autocracy". ("Foreign Policy". Nov.13, 2017)

MA'ARIF FEATURE - Publisher:Shahid Hashmi; Printer:Hassan M.Abbasi,City Press,Karachi; Office:D-35,Block-5,F.B.Area,Karachi-75950